کو کھلے ذہن سے سمجھنا نہیں چاہتے، انکار، تشکک، تذبذب، عقل پرستی کی بے راہ روی کے کالے بادل اسلام کے آسمان پر ہر زمانہ میں امنڈ کر آتے رہے ہیں، مگر انہی کے اندر سے اسلام کا آفتاب بھی برابر جگمگاتا ہوا نکلتا رہا ہے، اسی آفتاب کی ایک روح پرور شعاع تصوف ہے، اسلام سے اس کو روشنی ملی ہے تو یہ بھی انسانی زندگی کو اپنی روحانی تعلیمات سے روشن کرتا رہے گا،

مولانا ابو الحسن علی ندوی جو اس وقت دار المصنفین کے روح رواں ہیں، امریکہ کے ایک اسلامی ادارہ کی دعوت پر وہاں ایک لکچر دینے کیلئے گئے، ان کو اس ملک کے اور اداروں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، اسکی کچھ تفصیل معارف کی اس اشاعت کے مکتوب امریکہ سے معلوم ہوگی، انھوں نے اس سفر میں اپنی ایک آنکھ کا آپریشن بھی کرایا، جو بحمد اللہ بڑا کامیاب رہا۔ ان کی ایک آنکھ تو بالکل بے کار ہو چلی تھی دوسری آنکھ بھی برائے نام کام دے رہی تھی، بڑی خوشی ہے کہ آپریشن سے اس میں پھر روشنی آگئی ہے، وہ اپنی کمزور بینائی کے باوجود تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہ کر اپنے سینے کے خزینے کو سفینے میں برابر منتقل کرتے رہے، انشاء اللہ اُن کی اس نئی بصارت سے ان کی تحریریں اور بھی پُر از بصیرت ہوں گی،

......٥......

دار المصنفین میں یہ خبر بڑے دکھ اور رنج سے سنی گئی، کہ جناب عبد الرزاق قریشی اللہ کو پیارے ہوئے، اُن کی وفات سے نہ صرف اردو زبان و ادب ایک لائق خدمت گذار، بلکہ دار المصنفین ایک بہت ہی مخلص پرستار سے محروم ہو گیا، اُن کے اعزہ نے اُن کی وفات کی خبر بڑی تاخیر سے بھیجی، معارف کی آیندہ اشاعت میں ان پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہوگا، اس وقت تو اُن کی مغفرت کے لیے دل سے دعا نکل رہی ہے،

....

جلد ۱۲۱ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۷۷ء عدد ۳

مضامین

مقالات

شذرات

دہلی کے ایک سمینار میں بظاہر ایک متشرع اور دیندار عالم کی زبان سے بڑے دکھ کے ساتھ یہ سننے میں آیا کہ تصوف سے اسلام کو جتنا نقصان پہنچا کسی اور چیز سے نہیں پہنچا، اس سے پہلے دہلی کے ایک بین الاقوامی سمینار میں ایک یونیورسٹی کے ممتاز دانشور و عہدیدار ہوے کہ تصوف کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں، اس کی تائید ایران کے ایک مندوب نے بھی کی، جب خلافت راشدہ، حدیث، فقہ اور کلام کے منکرین ہو سکتے ہیں، تو تصوف کے منکرین پر کیا تعجب ہے،

تصوف پر یہ اعتراضات نئے نہیں، بہت پرانے ہیں، اُن کے مدلل جوابات بھی دیئے جاچکے ہیں، جن کو حقیقت اور صداقت کی جستجو رہی، اُن کی تشفی تو اُن جوابات سے ہوگئی، مگر جن کے اعتراضات ذہنی تفریحات یا مناظرانہ مباحثہ یا کسی مطلب برآری کے لئے تھے، اُن کی تشفی نہ ہو سکی، اور نہ آئندہ ہو سکے گی، اگر تصوف سے اسلام کو نقصان پہنچا تو کیا حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، اور ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، خواجہ باقی باللہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ وغیرہ جیسے بزرگان دین کو اسلام کو نقصان پہنچانے والوں میں شمار کیا جائے؟ کیا اُن کا تعلق اسلام سے نہ تھا؟ کیا یہ وہ مشاہیر اسلام نہیں ہیں جن کے جلوے مسلمانوں کی مذہبی اور روحانی تاریخ میں سمائے ہوئے ہیں؟ ان سب کے حالات زندگی سے ظاہر ہے کہ یہ اگر صوفی تھے تو عالم بھی تھے، ایک صوفی کا عالم ہونا ضروری ہے، ایک عالم اور صوفی میں کوئی تضاد نہیں، صرف دونوں کے روحانی مدارج میں فرق ہے، دونوں

کی منزل ایک ہوتی ہے، صرف کچھ طریقے الگ الگ ہوتے ہیں،

بگڑے ہوئے صوفیوں سے اسلام کو ضرور نقصان پہنچا، مگر بگڑے ہوئے علماء سے بھی تو اسلام کو نقصان پہنچتا رہا ہے، اگر بگڑے ہوئے علماء کی وجہ سے اسلام کو برا کہنا غلط ہے، تو بگڑے ہوئے صوفیوں کی وجہ سے تصوف کو برا کہنا کہاں تک صحیح ہے؟ ریاکار صوفیوں کی مذمت ہر زمانہ میں کی گئی ہے، آج سے تقریباً نوسو سال پہلے شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ نے اپنی تصنیف کشف المحجوب میں ایسے دنیا دار صوفیوں کو جن کے سامنے محض مال و منال یا جاہ و حشمت ہوتی ہے، صاحب وصول اور صاحب اصول کے بجائے صاحب فضول کہا ہے اور انکی مذمت کی ہے، اس برصغیر میں کشف المحجوب تصوف کی مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں یہ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ جس طرح آفتاب سے نور، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح تصوف سے اسلامی شریعت الگ نہیں کی جا سکتی پاک طینت صوفیائے کرام کا یہی مسلک رہا ہے، اُن کے نزدیک وہ عبادات، کرامات، احوال اور کیفیات حتیٰ کہ علوم لدنیہ اگر شریعت کے مطابق نہیں تو وہ ضلالت، گمراہی اور بے دینی ہیں، شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جن صوفیہ نے کتاب و سنت کو ترک کردیا وہ ہم میں سے نہیں، مگر اسی کے ساتھ وہ ان علماء کے لئے جو تصوف کا انکار کرتے ہیں بہت ہی برے الفاظ استعمال کئے ہیں،

اس برصغیر میں موجودہ صدی کے سب سے بڑے مفکر اسلام اقبال خانقاہوں میں مجاور بن کر رہنے والے صوفیوں کو تو بہت برا سمجھتے رہے مگر وہ مہ و انجم کے محاسب اور ایام کے راکب صوفیوں کے معترف تھے، وہ اس کے بھی قائل تھے، کہ تصوف ہی کی خلوت میں سوز سخن حاصل ہو سکتا ہے، شرع مسلمانی کے ساتھ جذب مسلمانی ہی سے سر فلک افلاک حاصل ہو سکتا ہے، مومن کی امیری اس کی فقیری ہی میں ہے، مسلمانوں کو تونگری سے نہیں، قلندری سے سب کچھ حاصل ہوا، اُن کی نگاہ جہاں بیں اسی وقت ہو سکتی ہے، جب پاک ہو، اور یہ فقیری ہی سے پاک ہوتی رہی ہے، مگر یہ سارے دلائل ان کے لئے بیکار ہیں، جو کسی چیز

کو کھلے ذہن سے سمجھنا نہیں چاہتے، انکار، تشکک، تذبذب، عقل پرستی کی بے راہ روی کے کالے بادل اسلام کے آسمان پر ہر زمانہ میں امنڈ کر آتے رہے ہیں، مگر انہی کے اندر سے اسلام کا آفتاب بھی برابر جگمگاتا ہوا نکلتا رہا ہے، اسی آفتاب کی ایک روح پرور شعاع تصوف ہے، اسلام سے اس کو روشنی ملی ہے تو یہ بھی اسی زندگی کو اپنی روحانی تعلیمات سے روشن کرتا رہے گا،

مولانا ابوالحسن علی ندوی جو اس وقت دارالمصنفین کے رئیس رواں ہیں امریکہ کے ایک اسلامی ادارہ کی دعوت پر وہاں ایک لکچر دینے کیلئے گئے، ان کو اس ملک کے اورا داروں کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، اس کی کچھ تفصیل معارف کی اس اشاعت کے مکتوب امریکہ سے معلوم ہوگی، انھوں نے اس سفر میں اپنی ایک آنکھ کا آپریشن بھی کرایا، جو بحمد اللہ بڑا کامیاب رہا۔ ان کی ایک آنکھ تو بالکل بے کار ہو چکی تھی دوسری آنکھ بھی برائے نام کام دے رہی تھی، بڑی خوشی ہے کہ آپریشن سے اس میں پھر روشنی آگئی ہے، وہ اپنی کمزور بینائی کے باوجود تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہ کر اپنے سینے کے خزینے کو سفینے میں برابر منتقل کرتے رہے، انشاء اللہ اُن کی اس نئی بصارت سے ان کی تحریریں اور بھی پُر از بصیرت ہوں گی،

......ہ ... ہ......

دارالمصنفین میں یہ خبر بڑے دکھ اور رنج سے سنی گئی، کہ جناب عبدالرزاق قریشی اللہ کو پیارے ہوئے، اُن کی وفات سے نہ صرف اردو زبان و ادب ایک لائق خدمت گذار، بلکہ دارالمصنفین ایک بہت ہی مخلص پرستار سے محروم ہو گیا، اُن کے اعزہ نے اُن کی وفات کی خبر بڑی تاخیر سے بھیجی، معارف کی آیندہ اشاعت میں ان پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہوگا، اس وقت تو اُن کی مغفرت کے لیے دل سے دعا نکل رہی ہے،

....

مقالات

تقدیر امم اور علامہ اقبال

از۔ ڈاکٹر محمد ریاض تہران یونیورسٹی

(۲)

۔ اقبالؒ ملت کے لیے مفید اور پابندِ ضابطہ قوت کے حصول کے آرزومند تھے، اسی لیے وہ قوت و شکوہ سے محروم نبوت کو بھی اہمیت نہیں دیتے:۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے — صاحب نظراں، نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے — عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر — ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار
فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اسکی — جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے — غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

اقبال کا مہدی، یا مردِ منتظر وہی ہے جو خود آگاہ اور خودنگر ہو، ان کے نزدیک ملت کی بیداری کی خاطر مہدی، مردِ منتظر یا فوق البشر کے تصورات کی تشہیر بری نہیں ہے اس ضمن میں وہ نیٹشے (م ۱۹۰۰ء) کے تصور فوق البشر اور جرمنوں کی بیداری کی مثال دیتے ہیں

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغِ چمن کو

مجذوب فرنگی نے بانداز فرنگی
مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار
نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

ہو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں
یا چاک کریں مردکِ نادان کے کفن کو

علامہ مغفور کی یہ جدت اور ندرت ملاحظہ ہو کہ وہ حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹ھ) کی شطحیاتی گفتگو "انا الحق" کو فرد کے لیے ناروا مگر ملت کے لیے روا بتاتے ہیں۔ مدعا یہ کہ فرد کا دعوئ حقانیت گمراہ آمیز ہو سکتا ہے، مگر ملت اسلامیہ کی سی ملت حق کے لیے ایسا ادعا نامناسب نہیں، کیونکہ اسے اپنے راہ حق پر گامزن ہو جانے کا یقین ہے اور خدا کے سوا اسے کسی کا غلبہ و تفوق منظور نہیں ہے۔ انا الحق کی یہ ملی توضیح ارمغانِ حجاز میں دیکھی جا سکتی ہے کہ

انا الحق جز مقام کبریا نیست
سزائے او چلیپا ہست یا نیست

اگر فردے بگوید سرزنش بہ
اگر قومے بگوید ناروا نیست

بہ آں ملت انا الحق سازگار است
کہ از خونش نم ہر شاخسار است

نہاں اندر جلالِ او جمالے
کہ او را نُہ سپہر آئینہ دار است

میانِ امتاں والا مقام است
کہ آں ملت دو گیتی را امام است

نیاساید ز کارِ آفرینش
کہ خواب و خستگی بر وے حرام است

وجودش شعلہ از سوزِ درون است
چو خس او را جہانِ چند و چون است

کند شرحِ "انا الحق" ہمتِ او
پئے "ہر کن" کہ می گوید "یکون" است

بجام نو کہن مے از سبو ریز
فروغِ خویش را بر کاخ و کو ریز

اگر خواہی ثمر از شاخِ منصور
بہ دل "لا غالب الا اللہ" فرو ریز

ماضی سے رابطہ کو اب ماہرین سیاست بھی اہمیت دینے لگے ہیں اور بالکل نیا طرزِ عمل اختیار کرنے والی اقوام ہی اس رابطے کی منکر ہوں گی۔ مسلمانوں کا رابطہ انبیاء و رسل کی تاریخ اور خصوصاً تاریخ اسلام کے ساتھ ہے۔ اقبال نے اس رابطے کو مستحکم رکھنے اور توحید خداوندی کی نشر و اشاعت کے لیے ملت اسلامیہ کو متعدد مقامات پر تاکید کی ہے، ذیل کے اشعار مثنوی رموز بیخودی سے نقل کیے جا رہے ہیں:-

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ
داستانے قصہ افسانہ

این ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مرد رہ کند

روح را سرمایۂ تاب است این
جسم ملت را چو اعصاب است این

شمع او بختِ امم را کوکب است
روشن از وے امشب ہم دیشب است

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

دوش را پیوند با امروز کن
زندگی را مرغِ دست آموز کن

رشتۂ ایام را آور بدست
ورنہ گردی روز کور و شب پرست

سر زند از ماضیِ تو حالِ تو خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است مے کشاں را شورِ قلقل زندگی است

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ انتہائے کارِ عالم لا الٰہ

چرخ را از زورِ او گردندگی مہر را پایندگی رخشندگی

بحر گوہر آفرید از تابِ او موج در دریا تپید از تابِ او

صد نوا داری چو خون در تن رواں خیز و مضرابے بہ تارِ او رساں

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست

تا نخیزد بانگِ حق از عالمے گر مسلمانی نیاسائی دمے

می ندانی آیۂ ام الکتاب امتِ عادل ترا آمد خطاب (۲:۱۴۳)

آب و تابِ چہرۂ ایامِ تو در جہاں شاہد علی الاقوامِ تو

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ از علومِ امیے پیغام دہ

امیے پاک از ہویٰ گفتارِ او شرحِ رمزِ ما غویٰ گفتارِ او (سورۂ نجم)

اے کہ خوردستی ز مینائے خلیلؑ گرمیِ خونت ز صہبائے خلیلؑ

بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن تیغِ لا موجود الا ھو بزن

جلوہ در تاریکیِ ایام کن آنچہ بر تو کامل آمد عام کن (۵:۳)

لرزم از شرمِ تو چوں روزِ شمار پرسدت آں آبروئے روزگار

حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ پس چرا با دیگراں نسپردۂ

اقبال بیداریٔ دل (عقل پر عشق کی برتری) اور ادب برائے زندگی کو بھی

عروج و سربلندیٔ امم کے لوازم میں شمار کرتے ہیں،

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کراری مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

جہاں زیرِ دمِ زناری اوست کشادِ ہر گرہ از زاریِ اوست

پیامے دِہ ز من ہندوستاں را غلام آزاد از بیداریِ اوست

دلِ ما آتش و تن موجِ دودش تپیدم دمبدم سازِ وجودش

بذکرِ نیم شب جمعیتِ او چو سیمابے کہ بند و چوب عودش

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات | نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی | خودی سے جب ادب و دین ہوئے ہیں بیگانہ

اشعار بالا کی بلاغت کا تقاضا ہے کہ بزبان نثر ان کی توضیح نہ کی جائے۔

امت مسلمہ کے اسباب زوال

امت مسلمہ کے موجودہ زوال (غلامی، علمی اور معاشرتی تقلید نیز معاشی پسماندگی) کے اسباب اقبال نے کئی مواقع پر گنائے ہیں، جو اسباب انھوں نے بتائے ہیں ان کے مزید شاخ و برگ نکالے جا سکتے ہیں، اور بعض مسلمان ممالک کے مخصوص حالات کے پیش نظر بعض اسباب کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے مگر حکیم الامت کی کسی ایک تشخیص سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی شاہکار تالیف 'جاوید نامہ' میں انھوں نے مظلوم انسانوں اور مسلمانوں کے اسباب زوال بڑی صراحت سے بیان فرمائے ہیں، شاعر ماورائے افلاک، قوت عشق کے ذریعے جمال باری کے حضور حوادث دنیا کو یوں بیان کرتا ہے،

غالباں غرق اند در عیش و طرب | کار مغلوباں شمار روز و شب
از ملوکیت جہان تو خراب | تیرہ شب در آستین آفتاب
دانش افرنگیان غارت گری | دیرہا خیبر شد از بے حیدری
آنکہ گوید لا الٰہ بیچارہ ایست | فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست
چار مرگ اندر پئے این دیر میر | سود خوار و والی و مُلّا و پیر

اقوام عالم کو استبدادی نظام اور مغربی علم و دانش کی سفاکیت نے دبا رکھا ہے، مگر مسلمانوں کو لامرکزیت (عدم اتحاد اور توحید کے مضمرات سے روگردانی) نے فکر و عمل سے محروم کر رکھا ہے، اور سود خوار، والی، مُلّا، اور پیر اُن کے لیے

وبال جان بنے ہوئے ہیں، توحید کے اتحاد آموز تقاضے اقبال نے ایک اردو قطعے میں یوں بیان فرمائے ہیں :۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی | آج کیا ہے فقط اک مسئلۂ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو | خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے | قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہہ | وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟ | اسکو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

جاوید نامہ میں یہی بحث ایک دوسرے اسلوب سے ملتی ہے، شاعر زندہ رود) پوچھتا ہے کہ آیا مسلمان اپنے موجودہ زوال اور اضمحلال پر خاموش رہیں، یا انقلاب حال کے لیے نتیجہ خیز جد وجہد کریں ؟ ندائے جمال سے یہ پیغام ملتا ہے کہ احیائے ملی ناممکن نہیں، اگر مسلمان توحید کے عملی تقاضے اپنا لیں تو دوبارہ سربلند ہو سکتے ہیں، توحید کے عملی تقاضے یہ ہیں کہ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک مرکز ملی (کعبہ) کو ماننے والے، اپنے فروعی اختلافی مسائل کو بالائے طاق رکھ کر فکر و عمل کی وحدت و یگانگت کو اپنا شعار بنائیں۔

زندہ رود: چیست آئین جہان رنگ و بو | جز کہ آب رفتہ می ناید بجو
زندگانی را سر تکرار نیست | فطرت او خوگر تکرار نیست
زیر گردوں رجعت او را نارواست | چوں ز پا افتاد قومے بر نخاست
ملتے چوں مرد، کم خیزد ز قبر | چارۂ او چیست غیر از قبر و صبر
ندائے جمال: زندگانی نیست تکرار نفس | اصل او از حیّ و قیوم است و بس

قرب جان با آنکہ گفت انی قریب — از حیات جاوداں بردن نصیب

فرد از توحید لاہوتی شود — ملت از توحید جبروتی شود

بے تجلی نیست آدم را ثبات — جلوۂ ما فرد و ملت را حیات

ہر دو از توحید می گیرد کمال — زندگی این را جلال آں را جمال

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

اہل حق را حجت و دعویٰ یکے است — خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکے است

یک نگاہی را بچشم کم مبین — از تجلی ہائے توحید است این

ملتے چوں می شود توحید مست — قوت و جبروت می آید بدست

مردۂ از یک نگاہی زندہ شو — بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

وحدت افکار و کردار آفریں — تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

ملوکیت جسے یہاں "دال" کے لفظ سے نمایاں کیا گیا، اقبال کی اصطلاح میں صرف شاہی نظام ہی نہیں، بلکہ ہر مستبد اور آمرانہ نظام حکمرانی (استحصالی طریق) ملوکیت کی ایک صورت ہے۔

کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے — یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو — ہے وہ سلطان، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

شرع ملوکانہ میں جدت احکام دیکھ — صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام

اقبال استبدادی اور استحصالی نظام سیاست کے بے حد خلاف تھے، اور مظلوموں کی حمایت میں انھوں نے بڑی دردمندی دکھائی ہے۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں، نوع انساں کا شکاری ہے

ہنوز اندر جہان آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است

غلام فقر آں گیتی پناہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است

خدا آں ملتے را سروری داد — کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت

بآں ملت سر و کارے ندارد — کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے اجتماعی زوال کے چار بڑے اسباب میں سے ایک ہی ملوکیت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر و کسریٰ کے سے حکمرانوں کی نابودی کا مژدہ سنایا تھا، مگر بدقسمتی دیکھیے کہ خود مسلمانوں نے آج تک قیصر و کسریٰ اپنا رکھے ہیں۔

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغ او نہ مے دیدم نہ درد

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست — خود سر تخت ملوکیت نشست

تا نہال سلطنت قوت گرفت — دین او نقش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر — عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

دوسرے اسباب میں سود خواری (ناجائز منافع خوری)، ملائی اور پیری مریدی ہے۔ اسلام نے تجارت کی حوصلہ افزائی اور سود خواری کی بیخ کنی کی مگر اس معاملے میں اسلام کے نام لیواؤں کا طرز عمل عجیب رہا ہے۔ انھوں نے بالعموم تجارت کو ترک کیے رکھا، اور جنھوں نے یہ پیشہ اختیار کیا، انھوں نے جائز منافع پر اکتفا نہ کیا بلکہ اکثر زراندوزی اور سود خواری میں مبتلا ہو گئے۔ ان محدود افراد نے تو پوری اکثریت کو استحصال کا نشانہ بنائے رکھا۔ پیر، ملا اور شیخ و صوفی کے خلاف اقبال نے بہت کچھ کہا ہے اور یہ محض سخن گسترانہ باتیں نہیں ہیں، مگر یہ یاد رہے کہ اقبال کا ہدف تنقید وہ انحطاط کے

ملا و صوفی ہیں ورنہ اکابر علما اور انسان آفریں صوفیہ کا انھوں نے ہمیشہ احترام کیا ہے۔
ترکی کے ایک معاصر روشن خیال سیاست داں شاہزادہ محمد سعید حلیم پاشا (۱۸۶۳-۱۹۲۱ء)
کے افکار بھی اسی قسم کے تھے، چنانچہ ان کے جس مبسوط مقالے کا انگریزی ترجمہ
حیدر آباد دکن کے سہ ماہی مجلہ "اسلامک کلچر" کی سب سے پہلی اشاعت (جنوری ۱۹۲۷ء)
میں شامل تھا، اسی کے پیش نظر اقبال نے جاوید نامہ میں، ان کا ذکر کیا، اور ان ہی کی
زبانی دورِ انحطاط کے علما رسوء اور ملاے غلط رو کے بارے میں یہ تبصرہ کیا ہے،

دین حق از کافری رسوا تر است — زانکہ ملا مومن کافر گر است
از شکر فیہاے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامین را در خروش
ز آنسوے گردوں دلش بیگانۂ — نزد او ام الکتاب افسانۂ
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد
دین کافر فکر و تدبیر جہاد — دین ملا فی سبیل اللہ فساد

اس ضمن میں ارمغان حجاز کی وہ رباعیاں قابل ذکر ہیں جن کا عنوان صوفی
و ملا ہے، ان میں صوفی و ملا کی گمراہ کن تاویلاتِ قرآن کا ذکر ہے، ان کی پست ہمتی کا
یہ حال ہے کہ مزار فروشی ان کا مدار رزق ہے، وہ لوگوں کو دوزخِ عقبیٰ سے ڈراتے ہیں،
مگر غلامی کی دوزخ کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتے، انھیں معابد و مکاتب کے فرنگی مآب
ہونے سے کوئی خوف نہیں آتا اور قرآن مجید ایسی سراپا حکمت کتاب کو انھوں نے
جھاڑ پھونک کا طومار بنا رکھا ہے،

ز من بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شان در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

دوزخ واعظ کافر گرے گفت — حدیثے خوشتر از وے کافرے گفت
نداند آں غلام احوالِ خود را — کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت
مریدے خود شناسے پختہ کارے — بہ پیرے گفت حرفِ نیش دارے
بمرگ ناتمامے جاں سپردن — گرفتن روزی از خاکِ مزارے

فرنگی صید بست از کعبہ و دیر — صدا از خانقاہان رفت لا غیر
حکایت پیش ملا باز گفتم — دعا فرمود یارب عاقبت خیر
بہ بند صوفی و ملا اسیری — حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست — کہ از یاسین او آساں بمیری

ذیل کے اشعار میں صوفی و ملا کی بے عملی و ریا آمیز دین داری، سربزیری، دعا و
کرامات فروشی اور مسائل ملی سے غفلت دبے تو بھی اس قدر نمایاں ہے کہ کسی توضیح
کی ضرورت نہیں،

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ — فتنۂ او حبِ مال و ترسِ مرگ

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال — ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست،

فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

ز رومی گیر اسرار فقیری — کہ آں فقر است محسود امیری
حذر زاں فقر و درویشی کہ از وے — رسیدی بر مقام سر بزیری

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات — ہر چند کہ مشہور نہیں ان کے کرامات
خود گیری و خود داری و گلبانگِ انا الحق — آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست — خود مردہ و خود مرقد و خود مرگ مفاجات

بعض اشعار میں اقبال نے صوفی و ملا کے ساتھ جمود آموز شعراء کی بھی خبر لی ہے:

چہ گویمت کہ چہ بودی، چہ کردۂ، چہ شدی — کہ خوں کند جگرم مرد ایازی محمود
تو آں نہ کہ مصلیٰ ز کہکشاں می کرد — شراب صوفی و شاعر ترا از خویش ربود
(زبورِ عجم)

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے — فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

بہر حال ملاؤں اور صوفیوں کے نام اقبال کا پیغام یہ ہے کہ

اے پیرِ حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ — مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت — دے انکو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار — شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

این نکتہ کشایندۂ اسرار نہان است — ملک است تنِ خاکی و دین روح و روان است
تن زندہ و جاں زندہ ز ربط تن و جان است — با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

از خواب گراں خیز

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی "پس چہ باید کرد" کی طرف اشارہ کر دیا جائے، یہ تقدیر امم کا آئینہ خانہ ہے، اس میں اقبال نظامہائے زندگی اور نظریات حکمرانی پر روشنی ڈالتے ہیں، ایک نظام انکار خدا پر مبنی ہے جو جلد یا بدیر نابود ہو جائے گا، کیونکہ الحاد ایک غیر معقول اور غیر منطقی روش ہے،

در مقام لا نیاساید حیات — سوئے الا می خرامد کائنات

لاو الا برگ و ساز امتاں | نفی بے اثبات، مرگِ امتاں

دوسرا نظام جو حکمت فرعونی پر مبنی ہے، اور حکمراں پرستی کی تلقین کرتا ہے، یہ صرف دین و سیاست کی جدائی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دین کو سیاست کے تابع رکھتا ہے، پہلے نظام کی طرح یہ نظام بھی دنیا میں بہت رائج رہا ہے،

ہر زماں اندر تلاش ساز و برگ | کار او فکر معاش و ترس مرگ
منعمان او بخیل و عیش دوست | غافل از مغز اند و اندر بند پوست
قوت فرماں روا معبود او | در زیانِ دین و ایماں سود او
از نیاکاں دفترے اندر بغل | الاماں از گفتہ ہائے بے عمل
دین او عہد وفا بستن بغیر | یعنی از خشت حرم تعمیر دیر
دختران او بزلفِ خود اسیر | شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر
از حد امروز خود بیروں نجست | روزگارش نقش یک فردا نبست

تیسرا نظام یعنی نظام حیات اقبال کا پسندیدہ نظام حیات ہے، انھوں نے اس مثنوی میں اسے حکمت کلیمی کا عنوان دیا ہے، یہ مرد مومن کا نظام زندگی ہے، جس میں دین و سیاست ایک ہیں، اقبال کی تصانیف کا معتد بہ حصہ اسی نظام کی توضیح و تشریح کے لیے وقف ہے اسی نظام نے ہر دور میں انسانیت کو نیک نام کیا، تقدیر امم کی پائداری اسی کے ساتھ مشروط ہے، کیونکہ:-

ابتدائے عشق و مستی قاہری است | انتہائے عشق و مستی دلبری است
مرد مومن از کمالات وجود | او وجود و غیر او ہر شی نمود

اسیطرح مثنوی، مسافر کا وہ حصہ بھی توجہ طلب ہے جس میں اقبال نے افغانستان کے بادشاہ کو تقدیر امم کے قرآنی فلسفے کی طرف راہنمائی فرمائی ہے،

مولانا شاہ محمد بدر الدینؒ

از جناب مولوی عاصم صاحب قادری ندوی

شریعت و طریقت کی جامعیت اور گوناگون محاسن و کمالات کی بنا پر مولانا شاہ بدر الدین رحمۃ اللہ علیہ کو تیرھویں صدی ہجری کے علما و مشائخ کی صف میں بڑا امتیازی مقام حاصل ہے، زیر نظر مضمون ان کے پوتے شاہ عون احمد صاحب کی رہنمائی میں مرتب کیا گیا ہے۔ (معارف)

مولد و مسکن پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں ۲۰ جمادی الاخری ۱۲۶۸ھ کو یکشنبہ کے دن آپ کی ولادت ہوئی، یہیں مستقل طور پر قیام فرمایا، اور اسی کی خاک میں آسودہ خواب ہوئے۔

تاریخ پھلواری شریف یہ قصبہ تقریباً ہزار سال سے آباد ہے، کہا جاتا ہے کہ پہلے یہاں راجہ اشوک کا باغ تھا، اسی مناسبت سے راجہ کی پھلواری کے نام سے مشہور تھا، امتداد زمانہ سے باغ کی وہ شکل باقی نہیں رہی، مگر پھلواری کا نام زبانوں پر چڑھ گیا، عرصہ تک یہ سنیاسیوں اور جوگیوں کا مسکن رہا، کچھ مدت کے بعد سراوک اور جین مذہب کے فقراء آباد ہوئے، اسلامی آبادی کی باقاعدہ ابتدا عہد فیروز شاہی میں حضرت مخدوم منہاج الدین راستی قدس سرہ کی تشریف آوری کے بعد ہوئی، آپ جیلان سے بہار تشریف لائے،

اور حضرت شیخ الاسلام مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہٗ کے عظیم المرتبت
خلیفہ ہوئے، پیر و مرشد نے [illegible]ھ میں پھلواری تشریف لاکر انھیں مسند ارشاد و ہدایت
پر بٹھایا، ان کی تشریف آوری سے علم و عرفان کی شعاعیں دور دور تک پھیلیں ان کی اولاد
و احفاد میں بہت سے علما و فضلا اور قضاۃ پیدا ہوئے اور پورا صوبہ ان کے علم و عرفان سے
منور ہو گیا، لیکن اس سرزمین کو علم و فضل کے لعل و گہر حضرت امیر عطاء اللہ جعفری المتوفی
۹۶۲ھ کے دم قدم سے نصیب ہوئے، یہ اپنے والد شاہ محمد سعد اللہ کے ہمراہ دسویں صدی
کے اوائل میں پھلواری آئے، شاہ سعد اللہ کے والد شاہ فتح اللہ مخدوم نور الدین ملک یار
پراں متوفی ۶۹۵ھ کی صاحبزادی کی اولاد میں تھے، حضرت شیخ عبد الحق محدث
دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں مخدوم نور الدین کا تذکرہ کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ امیر عطاء اللہ
وزرائے شاہی میں تھے، ابو الفضل کے اکبرنامہ میں بہ ضمن وقائع ۹۶۱ھ امیر عطاء اللہ
کا نام بھی ایک جگہ مذکور ہے، پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں شاہان مغلیہ کے البم میں ان کا
ایک مرقع موجود ہے، اگرچہ اس کی صحت یا عدم صحت کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں لیکن
مرقع کے حاشیہ پر یہ عبارت لکھی ہے،

"امیر عطاء اللہ جعفری وزیر ہمایوں بادشاہ"

امیر عطاء اللہ کی اولاد کے دینی و تبلیغی کاموں سے پھلواری کو بڑا شرف حاصل ہوا
اور ان کے علم و عرفان کے پھولوں نے حقیقی معنوں میں اسے پھلواری بنا دیا[1]، ان کے
اخلاف میں مشائخ عظام، عرفائے طریق، علماء محققین، شعراء، مورخین اور ولاۃ و قضاۃ،
نیز ارباب خبر و بصر کا ایک ایسا سلسلۃ الذہب نظر آتا ہے، جس کے علمی، عرفانی، تحقیقی،
ادبی اور تاریخی کارنامے صدیوں پر محیط ہیں، ان ہی کی اولاد کرام میں حضرت مخدوم شمس الدین

[1] حیات محی الملۃ والدین ص ۳ از مولانا شاہ عون احمد قادری

جنید ثانی المتوفی ۱۰۰۲ھ حضرت خواجہ عماد الدین قلندر المتوفی ۱۱۲۴ھ حضرت تاج العارفین
مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ قدس سرہ المتوفی ۱۱۹۱ھ جیسے اہم اکابر اولیاء اور ملا فصیح الدین
جعفری المتوفی ۱۱۱۹ھ ملا مبین المتوفی ۱۱۵۴ھ ملا وجیہ الحق محدث المتوفی
۱۱۵۰ھ تلمیذ ملا غلیق محدث بہاری، ملا وحید الحق ابدال المتوفی ۱۲۰۰ھ سید العلماء مولینا
احمدی المتوفی ۱۲۵۱ھ مولانا آل احمد محدث ملا ماجد مدنی المتوفی ۱۱۹۵ھ اور حضرت مصباح العاشقین
مولانا شاہ علی حبیب نصر المتوفی ۱۲۲۵ھ جیسے شیوخ حدیث، فقہاء، اور مجددین طریقت
اور حضرت شاہ ابو الحسن فرد المتوفی ۱۲۴۴ھ اور حضرت شاہ ابو تراب آشام ۱۱۷۰ھ
جیسے اصحاب دیوان شعراء ہیں،

یہ تمام حضرات اپنے علم و فضل، درس و تدریس، اور تصنیف و تالیف کی بنا پر بڑی
عظیم شہرت رکھتے تھے، علماء و مشائخ کے مستند تذکروں اور تاریخی ماخذ میں ان اکابر کا
تذکرہ ہے اور متعدد موضوعات پر انکی تصانیف آج بھی کتب خانہ مجیبی کی زینت ہیں،

خاندان اور سلسلہ نسب

حضرت شاہ بدر الدین رحمہ اللہ اس خانوادۂ علم و عرفان کے گل
سر سبد ہیں، جسمیں چھ سو برس سے بلافصل ارباب فضل و کمال کے ظہور کا سلسلہ جاری ہے،
آبائی سلسلۂ نسب حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے
صاحبزادے حضرت عبد اللہ سے حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کی صاحبزادی
سیدہ زینب منسوب تھیں ان سے حضرت علی زینبی پیدا ہوئے، اس بنا پر انکی اولاد
جعفری کے ساتھ زینبی بھی کہلاتی ہے، مادری سلسلۃ النسب حضرت شیخ عبد القادر
جیلانی تک پہنچتا ہے۔

تعلیم و تربیت

آپ نے علم و فضل کے ایسے مرکز میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں صدیوں سے

درس وتدریس اور ارشاد وہدایت کا سلسلہ جاری تھا، آپ کے بعض اکابر کا سلسلۂ علمی ایک طرف حضرت ملا نظام الدینؒ سے ملتا ہے، تو دوسری طرف شیخ عبدالحق محدث دہلوی تک پہنچتا ہے، اور تیسری جانب حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے بھی جا ملتا ہے، آپ کے خانوادے کے اکثر علما معقولات میں مولانا فضل حق اور مولانا عبدالحق خیرآبادی سے بھی نسبت تلمذ رکھتے تھے، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان تمام علمی سرچشموں کی یکجائی نے پھلواری کے مرکز علمی کو ایک یگانۂ روزگار، جامعہ بنا دیا تھا۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ شرف الدین نہایت جید الاستعداد اور بالغ النظر عالم تھے، وہ متعدد اہم رسائل وکتب کے مصنف[۱] کی حیثیت سے علمی حلقوں، خانقاہ جنیدیہ پھلواری شریف کے ممتاز فرد کی حیثیت سے عرفانی مجلسوں اور صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے ادبی محفلوں میں معروف ومشہور تھے،

ان کے پیر ومرشد شاہ علی حبیب نصرؒ عظیم محدث اور بلند پایہ مجتہد تھے، اس لیے علم وفن کی تحصیل کے لیے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں پیش آئی اور درسیات کی تکمیل انھیں دونوں بزرگوں سے کرلی،

شیخ الاسلام حضرت نصرؒ کے فیضان درس سے حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیات کا نہایت بلند ذوق پیدا ہوا، ان کے علاوہ دوسرے متعدد شیوخ عرب وعجم سے بھی اس کی سند حاصل کی، بخاری شریف کی سب سے پہلی سند قرأت وسماعت

[۱] عقائد نسفی کی شرح لب العقائد، تہذیب کی مختصر شرح، رسالہ رفع السبابہ عند التشہد وغیرہ آپ کے مصنفات میں سے ہیں، کتب خانہ مجیبی میں آپ کا مکمل دیوان بھی ہے،

حضرت نصر قدس سرہٗ سے حاصل کی، پھر ۱۲۷۸ھ میں حصن حصین اور دیگر کتب حدیث کی سند حضرت مولانا آل احمد مہاجر مدنی قدس سرہٗ سے حاصل کی، ۱۳۰۴ھ میں سفر حج کے موقع پر حرمین شریفین کے جن بزرگوں سے سند حاصل کی ان میں حضرت شیخ عبداللہ صالح سناری، سید محمد امین بن سید احمد بن رضوان، شیخ عبدالرحمن ابوحضیرہ فی، شیخ الدلائل مولانا عبدالحق مہاجر مکی، سید محمد بن علی حریری اور سید محمد سعید بن سید محمد مغربی بیحد اہمیت رکھتے ہیں،

مراجعت وطن کے بعد بذریعہ مراسلت شیخ عبدالجلیل ابن عبدالسلام برادہ شیخ محمد فالح ظاہری، شیخ عبدالحی کتانی، شیخ سلیمان حبیب اللہ اور دیگر شیوخ حرمین ومصر وشام وبیروت سے اجازت وسند حاصل کی،

تجوید وقرأت

آپ کے بزرگوں کو تجوید کا ہمیشہ سے خصوصی ذوق رہا ہے اور اس فن کی تحصیل بڑے اہتمام کے ساتھ کرتے رہے ہیں، آپ کے خلف اکبر حضرت پیر ومرشد مولانا سید شاہ محی الدین پھلواروی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس خاندان میں تجوید کا علم برابر رہا، چونکہ بزرگان اہل دل صاحب حال تھے، ان کی قرأت کا خاص اثر سننے والوں پر پڑتا تھا حضرت ملا وجیہ الحق محدث نے کلام اللہ کا ایک ایسا نسخہ تحریر فرمایا ہے، جو کل قرأتوں میں ہے، حاشیہ پر کل قرأتوں کی تفصیل ہے، جس کے سمجھنے والے اب شاذ ونادر ہیں۔"

حضرت ملا وجیہ الحق محدث (تلمیذ ارشد ملا عتیق محدث بہاری ۱۱۳۵ھ) کے دست خاص کا لکھا ہوا کلام اللہ کا یہ نسخہ کتب خانہ مجیبی میں اب بھی موجود ہے،

اس کی کتابت الفاظ و اعراب کی صحت کے ساتھ دو ماہ ۲۶ دن میں تمام ہوئی سنہ کتابت ۱۲۸۵ھ ہے، بین السطور اور حواشی پر قرأت کے اختلافات اور تجوید کے فوائد موجود ہیں[1]

مولانا شاہ بدر الدینؒ نے بھی اس فن کی تحصیل شیخ الاسلام حضرت نصرؒ مولانا آل احمد محدث مہاجر مدنی، اور اپنے والد ماجد مولانا شاہ شرف الدین سے کی،

خطاطی و طغرا نویسی اگرچہ خطاطی کی باقاعدہ تحصیل نہیں کی لیکن طبعی طور پر آپ خوش نویس تھے، اور نسخ و نستعلیق دونوں خط بہت پاکیزہ تھے، طغرا نویسی کا فن منشی ولی الحق بن شیخ حمید الدین عیسیٰ پوری سے حاصل کیا تھا، آپ کے دست خاص کے بنائے ہوئے خوشنما طغرے آج بھی موجود ہیں،

مسند تدریس اپنی خداداد ذہانت و طباعی کی وجہ سے بہت کمسنی ہی میں درسیات سے فارغ ہو گئے تھے، یوں تو جملہ علوم و فنون میں دستگاہ کامل حاصل تھی مگر حدیث و تفسیر اور علوم عرفانیہ سے خصوصی شغف تھا، اس لئے اپنے اکابر کے تتبع میں جب آپ نے خانقاہ مجیبیہ کے دارالعلوم کی مسند تدریس کو زینت بخشی تو خصوصیت کے ساتھ تفسیر و حدیث اور تصوف کی کتابیں سپرد کی گئیں، غوامض علمی کی محققانہ توضیح اور تعلیم و تدریس کی دقیقہ سنجیوں کی بنا پر تھوڑے ہی دنوں میں ارباب ذوق کا ہجوم ہو گیا، آپ کے تلامذہ میں آپ کے صاحبزادہ مولانا شاہ محی الدین کے علاوہ حکیم حبیب الحسنین دیسنوی برادر بزرگ علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید معین الدینؒ رضوی، حافظ انور علی مونگیری، مولانا عبد الرحمٰن بھپوری، مولانا حافظ وسیع الدین

---

[1] حیات محی الملۃ والدین ص ۴۴ از مولانا شاہ عون احمد قادری

ہزاری باغ اور مولانا محمد بادشاہ نواکھالی قابل ذکر ہیں۔ آپ کی تدریسی مصروفیت سجادہ نشینی کے بعد بھی برقرار رہی، قرآن اور علوم احسان کی تدریس کا اہتمام جس وسیع پیمانے پر آپ نے کیا، اس کی مثال نہیں ملتی۔

اس سلسلہ میں مشائخ کے مکتوبات و ملفوظات کی تعلیم کی جانب خاص توجہ بھی تھی، معارف و حقائق کے بیان میں کتاب و سنت کے نصوص ہمیشہ پیش نظر رہتے تھے، اپنی خانقاہ میں خلوت نشین ہو کر درس قرآن کا سلسلہ سالہا سال تک بڑی پابندی کے ساتھ جاری رکھا، اتوار کے دن شائقین کا بڑا ہجوم ہوتا تھا، ان مجالس درس کے شرکاء میں آرہ، جہان آباد اور گیا کے جدید تعلیم یافتہ حضرات پٹنہ کے وکلاء، بیرسٹر اور وزراء افسران جسٹس نور الہدیٰ، سر فخر الدین وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس درس سے ایک طرف علما و مشائخ میں فکر و نظر کی بلندی پیدا ہوئی تو دوسری طرف علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اندر علم و عرفان کا ذوق پیدا ہوا،

بیعت طریقت عرفان و تصوف کا ذوق موروثی تھا، علوم ظاہری سے فراغت کے بعد خاندانی روایت کے مطابق تکمیل باطن کی طرف متوجہ ہوئے، دو شخصیتیں آپ کے سامنے تھیں، ایک شیخ الاسلام مولانا شاہ علی حبیب نصرؒ کی، دوسری اپنے والد ماجد شاہ شرف الدین کی،

حضرت نصرؒ، مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ کے جانشین اور والد ماجد خانقاہ جنیدیہ کے مجاز و ممتاز فرد تھے، حضرت نصرؒ اپنے مریدوں کو تعلیم و تلقین اور اذکار و اشغال کے لیے اکثر ان کے پاس بھیجا کرتے تھے، آپ کی ذات اقدس خانقاہ مجیبیہ کے دیگر مشائخ کی طرح جامع السلاسل تھی۔ مگر حضرت تاج العارفین کے عہد سے لیکر

آج تک یہاں کے مشائخ کے سلسلۂ بیعت میں قمیصیہ قادریہ دارثیہ طریقہ رائج ہے، جو حضرتِ محمد وارث رسول نما بنارسی کے واسطہ سے یہاں پہنچا ہے، حضرت نصرؒ آپ کے شیخ الحدیث بھی تھے، اور حضرتِ تاج العارفین کے جانشین بھی اس لیے آپ کا دلی رجحان ان ہی کی طرف ہوا، اور بائیسویں سال عین عالم شباب میں ۱۰ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ کو ان کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے،

تکمیل سلوک | جوہر معرفت طبعی طور پر آپ کے اندر موجود تھا، اس لیے مختصر عرصہ میں جملہ سلاسل کے اذکار و اشغال اور اوراد و ظائف کی تکمیل کر لی اور سخت ترین ریاضت و مجاہدہ کے ساتھ تمام مقامات طے کر لئے۔

اجازت وخلافت | انکم آمیزی، کم گوئی، تورع، اتباع سنت، تفکر اور مجاہدہ کی وجہ سے حلقہ مشائخ میں شروع ہی سے احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، اور بزرگوں کو بجا طور پر یہ توقع تھی کہ آپ کا مستقبل بہت ہی تابناک ہے، دریائے علم کی شناوری کے ساتھ بحر عرفان کی غواصی بھی کر چکے تو ۲۳ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ کو بغیر کسی طلب و سفارش کے شیخ الاسلام نصر قدس سرہٗ نے جملہ سلاسل مجیبیہ جنیدیہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ اور تمام مرویات حدیث کی اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا، اور اپنے مریدوں کو تعلیم و تلقین اور تصحیح اذکار کے لیے آپ کے پاس بھیجنے لگے، نیز خانقاہ مجیبیہ میں آنے جانے والوں کی خدمت بھی آپ ہی کے سپرد فرما دی اس سے پہلے ۱۲۸۹ھ میں آپ کے عم محترم حضرت شاہ فضل اللہ جانشین جنید ثانی مخدوم شمس الدین نے سلاسل جنیدیہ و مجیبیہ کی اجازت و خلافت مرحمت فرما کر خانقاہ جنیدیہ میں انھیں اپنا جانشین بنا چکے تھے،

مخدوم شمس الدین جنید ثانی کو ملا جمال اولیا کڑہ وی الہ آبادی سے خرقۂ خلافت اور سلاسل روحانی کی اجازت حاصل تھی، ان کے ذریعہ سلسلہ جمالیہ قادریہ کو بہت فروغ ہوا، شاہ امان علی ترقیؔ نے انکی فیض رسانی کا اس طرح ذکر کیا ہے،

بہ یاد حق بہ خلوت خانہ بنشست	بہ مردی آمد و مردانہ بنشست
جہانے کامیاب از فیض او شد	کہ ذرہ آفتاب از فیض او شد
یک عالم دید فقر و عز و شانش	مرید از صدق شد در خاندانش
ہزاراں از مریدان و ہوا خواہ	شدند از فیض ذات او حق آگاہ
ہر آں طالب کہ شد در خانقاہش	حضوری داشت در قرب الٰہش

سند اجازت وخلافت عطا کرنے وقت حضرت نصر قدس سرہٗ نے اپنے دست مبارک سے تبرکات پہنائے اتفاق سے اس وقت خوانچہ میں تسبیح تھی نہ کمر بند اس لئے اپنی تسبیح جو آپ کے ہاتھوں میں اس وقت موجود تھی دیدی اور اپنا کمر بند اپنی کمر سے کھول کر انکی کمر میں یہ شعر پڑھتے ہوئے باندھ دیا۔[1]

در خدمت حق گر تو مردانہ کمر بندی	بخشد بہ تو ہر لحظہ تاج دکمرے دیگر

خانقاہ مجیبیہ کی سجادگی | ۱۳۰۹ھ میں جب آپ کے پیرزادے مولانا شاہ عین الحقؒ خانقاہ مجیبیہ کی سجادگی ترک کر کے قصبہ گھگھٹہ ضلع چھپرہ میں مقیم ہو گئے تو جانشینی کا وہ سلسلہ جو حضرت مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ کی اولاد میں نسلاً بعد نسل چلا آ رہا تھا منقطع ہو گیا، ہر چند کہ اسوقت شیخ الاسلام شاہ نصر کے متعدد خلفاء موجود تھے، مگر چونکہ انھوں نے علمی و روحانی کمالات کی بنا پر اپنی زندگی ہی میں مریدین کی تعلیم و تربیت

[1] اعیان وطن از مولانا حکیم شعیب صاحب نیرؔ

اور خانقاہ کے نظم و اہتمام کی خدمات آپ کو تفویض کر دی تھیں۔ اس لیے تمام وابستگان خانوادۂ مجیبی نے جانشینی کے لیے آپ کا انتخاب کیا، اس طرح ۱۳۰۹ھ میں آپ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین قرار پائے اور آپ کی ذات خانقاہ مجیبیہ اور خانقاہ جنیدیہ کا نقطۂ اتصال ثابت ہوئی۔

تاریخ خانقاہ مجیبیہ — یہ خانقاہ مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ کی نسبت سے خانقاہ مجیبیہ کہلاتی ہے، انکا اسم گرامی محمد مجیب اللہ اور لقب تاج العارفین، آفتاب طریقت ہے، تاریخ ولادت ربیع الثانی ۱۰۹۳ھ کو اور وطن پھلواری شریف ہے، امیر محمد حسین بن امیر عطاء اللہ کی اولاد امجاد میں تھے، متوسطات تک تعلیم اپنے پھوپھی زاد بھائی خواجہ عماد الدین قلندر سے حاصل کی، اور ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی فرمائی، حضرت خواجہ کی کثرت مشاغل کی وجہ سے جب اسباق میں تسلسل باقی نہیں رہا تو ان کی اجازت سے بنارس تشریف لے گیے، اور حضرت سید محمد وارث رسول نما بنارسی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں زانوئے ادب تہ کیا، اور بقیہ درسیات کی تکمیل فرمائی۔

حضرت رسول نما جس طرح علوم ظاہری میں بے نظیر تھے، اسی طرح اقلیم عرفان میں درجۂ قطب الاقطاب پر فائز تھے، مخدوم تاج العارفین نے علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کی تکمیل بھی ان ہی سے کی مصنف بحر زخار کا بیان ہے

حضرت مولوی محمد وارث ساکن بنارسی اصلش غازی پور است و از اقامت در قند بنارسی مشہور شد توسل بیعت بہ سلسلۂ قمیص دارد و بہ رسول نما ملقب بودہ از سادات سوانہ است،

حضرت مولوی محمد وارث ساکن بنارس کا اصل وطن غازی پور ہے، لیکن بنارس میں اقامت اور قرار مبارک کی وجہ سے آپ بنارسی مشہور ہیں، سادات سوانہ مین ہیں، آپکا لقب رسول نما ہے، رشتہ بیعت سلسلہ قادری قمیصیہ کو رکھتے ہیں

حضرت رسول نما نے یاران کاملین کا اجتماع کر کے اپنی طرف سے بھی خرقہ پہنایا، اور تمام سلاسل کی تحریری اجازت اپنے دستخط اور اپنی مہر سے مزین فرما کر عطا کی،

حضرت خواجہ کی وفات کے بعد ۱۱۲۴ھ میں جب پھلواری شریف واپس آکر اپنے مسکونہ مکان کے ایک کمرے میں یاد الٰہی اور اذکار و اشغال کے لیے معتکف ہوئے تو یہ بیت الشرف مرجع خلائق ہوا، وفات کے بعد یہ خلوت خانہ اور گرد و پیش کی ساری عمارتیں، خانقاہ مجیبیہ کے نام سے موسوم ہوئیں،

حضرت تاج العارفین کو ۔ ۔ ۔ مولانا رسول نما، آفتاب طریقت اور شیخ الزمان کہا کرتے تھے، بارہوین صدی کے تمام تذکرے ان کے محامد و مناقب سے معمور ہیں۔

مصنف بحر زخار رقم طراز ہیں،

شاہ مجیب اللہ ساکن پھلواری است از پٹنہ چہار کروہ سمت مغرب بیعت بہ سلسلۂ قادریہ داشت میر جان علی فرزند سید عبد الواحد بلگرامی برگزار دکر من بخدمت آنحضرت رسیدہ ام از غایت ریاضت

شاہ مجیب اللہ پھلواری کے رہنے والے ہیں جو پٹنہ سے چہار کروہ دور پچھم کی جانب واقع ہے آپ کی بیعت سلسلۂ قادریہ میں ہے، میر جان علی فرزند سید عبد الواحد بلگرامی بیان کرتے ہیں کہ میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں، غایت عبادت

وجودش تودہ نور بود از غایت صفائی
قلب آئینۂ جہان نما در بغل داشت اظہار
محامد اش زائد از امکان تحریر و بیان
کمالاتش بیرون از تقریر۔

سے آپ تودۂ نور معلوم ہوتے تھے،
حد درجہ صفائی قلب کی وجہ سے اپنے پہلو
میں آئینۂ جہان نما رکھتے تھے آپکے محاسن
امکان تحریر سے فزوں تر اور آپ کے
کمالات حد بیان سے باہر ہیں،

حضرت شاہ بدرالدین اسی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے، جو پونے تین سو برس سے سرچشمۂ ارشاد و ہدایت ہے،

حضرت تاج العارفین کو اپنے آبائی سلاسل کے علاوہ دیگر بے شمار روحانی سلاسل میں بھی اجازت حاصل تھی، آپ کا آبائی سلسلہ، سلسلۂ قادریہ قلندریہ تھا، مگر حضرت رسول نما بنارسی قدس سرہ کی خواہش کے مطابق آپ اُن کے جانشین کی حیثیت سے مسند ارشاد پر متمکن ہوئے، اس لیے آپ کی تبعیت میں جملہ سجادہ نشینان خانقاہ مجیبی آپ کے جانشین ہوتے ہیں، اور آپ ہی کی نیابت میں فرائض ارشاد طریقت انجام دیتے ہیں، حضرت شاہ بدرالدین رحمہ اللہ بھی اسی حیثیت سے ،ر ذی الحجہ ۱۳۰۹ھ میں سجادۂ مجیبی پر رونق افروز ہوئے،

خانقاہ مجیبیہ کے مشائخ بہ نیت اعتکاف عزلت نشین ہو جاتے ہیں، پھر سفر مباح کی اجازت نہیں رہتی، ارشاد و ہدایت کے تمام امور اسی خلوت سے انجام دیتے ہیں، لیکن یہ گوشہ نشینی نہ فرضاً فرض و واجب نہیں ہے، جب خروج فرعاً فرض یا واجب ہوگا تو اس وقت گوشہ نشینی سے نکلنا ضروری ہوگا[1]

---

[1] حیات محی الملۃ والدین ص ۳۰، مرتبہ شاہ عون احمد صاحب قادری

آپ کے دور میں خانقاہ مجیبیہ مرجع خلائق ہو گئی، اور سلسلۂ مجیبیہ ہندوستان کے اطراف و جوانب کے علاوہ افغانستان، حجاز، عراق و شام اور افریقہ تک پہونچ گیا، آپ کی شخصیت بڑی پُرکشش تھی، آپ کی خدمت میں عام ارادت مندوں کے علاوہ علماء و مشائخ بھی استفاضہ کے لیے حاضر ہوتے تھے، اربعین (چلہ) میں بیٹھنے والوں کی خاصی تعداد موجود رہتی اُن کا روز و شغل کے ساتھ قرآن مجید اور مکتوبات صدی کا درس بھی دیتے تھے، باہر کے لوگ خطوط کے ذریعہ استفسار کرتے تھے، یہ مکتوبات علم و عرفان اور تحقیق و اجتہاد سے لبریز ہیں، نیز ان کے اندر اس زمانہ کے سیاسی و ملی حالات اور دنیائے اسلام کے واقعات کی جھلک بھی نظر آتی ہے، حکیم شعیب نیر رضوی نے ان مکتوبات کا ایک حصہ مرتب کر کے کئی جلدوں میں لمعات بدریہ کے نام سے شائع کر دیا ہے،

عارف محقق ان مکتوبات میں علمی و عرفانی مباحث ہوں سب میں ان کا مجتہدانہ رنگ نظر آتا ہے، . . . . . تصوف کے حقائق اور احسان و سلوک کے رموز پر آپ کی نگاہ محرمانہ تھی، آپ نے اس کے علمی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے بارہ سو سالہ علمی لٹریچر کا بھی وسیع مطالعہ کیا تھا، اور اس کی تمام روایات کا سراغ قرآن و سنت کے سرچشموں میں پا لیا تھا، جہاں کہیں اوہام کا غبار نظر آیا، آپ نے اب تحقیق سے اُسے صاف کر دیا، کسی سائل نے استفسار کیا کہ

کیا انا احمد بلا میم صحیح حدیث ہے؟ اگر حدیث نہیں تو کیا یہ ان باتوں میں ہے، جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں؟"

اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"یہ صحیح حدیث نہیں، موضوع (جعلی) ہے، صوفی تو اہل علم ہوا کرتے ہیں،

ان کا قول ہے کہ آیات قرآنی اور احادیث رسول ربانی دونوں کے خاص انوار ہیں، جن سے وہ پہچان لی جاتی ہیں، کلام اللہ کا نور احادیث نبوی ﷺ سے ممتاز نظر آتا ہے اور احادیث کا نور دوسروں کے اقوال سے الگ محسوس ہوتا ہے، احادیث موضوع اپنی ظلمت سے پہچانی جاتی ہیں، محدثین، محققین جنکی عمر خدمت احادیث شریفہ میں زیادہ گذری ہے، ان کو بھی ایسا ملکہ پیدا ہوتا ہے کہ موضوعات کو سنتے ہی پہچان لیتے ہیں، حاصل کلام یہ کہ صوفیہ کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے، جاہل متصوفین جو جا بیجا توحید کے مشرب کی باتیں کیا کرتے ہیں، (حالانکہ وحدۃ الوجود کا علمی مسئلہ بھی ان کی سمجھ سے باہر ہے) وہی اس جملہ انا احمد بلا میم کو حدیث کہتے ہیں۔"

پھر سینہ بہ سینہ چلی آنے والی باتوں کے متعلق آپ کی محققانہ وجرأت مندانہ وضاحت ملاحظہ ہو۔

"صوفیوں میں سینہ بہ سینہ چلی آنے والی باتیں کوئی خلاف شریعت نہیں ہیں' یہ دو قسم کی باتیں ہیں، اول وہ مرویات جو ان کو اپنے شیوخ کی روایت سے مسلسل پہنچی ہیں، دوم ان کے الہامات وانکشافات، اول قسم یعنی صوفیوں کی مرویات جو انکو اپنے شیوخ کے سلسلے سے پہونچی ہیں، ان میں سے کوئی روایت خلاف شریعت نہیں ہے یعنی شریعت کے احکام، جو فرض وسنت اور حلال وحرام کے متعلق ہیں، ان کے خلاف ان کی روایت کوئی بھی ایسی نہیں کہ کسی چیز کی فرضیت، یا سنت ہونے کا انکار کرے، یا غیر فرض کو فرض کہدے یا حرام کو حلال اور حلال کو حرام بتادے، دوسری

قسم صوفیوں کے انکشافات والہامات ہیں، اس کی بھی حالت یہ ہے کہ وہ مسائل متفقہ فقہی وعقائد صحیحۂ اہل سنت کے خلاف نہیں، کیونکہ مکاشفات اولیاء اللہ کا معیار یہ رکھا گیا ہے کہ اگر وہ کتاب وسنت کے موافق نہوں تو غلط اور باطل ہیں، یہ انکشافات اکثر احکام شریعت کے مفاد واسرار کے بیان میں ہوا کرتے ہیں، جو سب عین شریعت ہیں نہ خلاف شریعت، البتہ بعض باتیں نفس شریعت کے خلاف تو نہیں لیکن علمائے شریعت کے قول کے خلاف ہوتی ہیں، مثلاً علما نے ایک حدیث کو ضعیف بتایا اور اہل کشف کے نزدیک ان کے کشف سے وہ حدیث صحیح وقوی ہے یا اس کا عکس تو یہ کوئی نقصان کی بات نہیں، علما میں خود بہت سی احادیث کے ضعف وصحت میں باہم اختلاف ہے۔"

عرفانی علوم کی متعدد اصناف ہیں، اہم ترین صنف وہ ہے جس میں تصوف کے اساسی اصول ونظریات بیان کیے گئے ہیں، ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ یہ نظریات غیر قرآنی ہیں، اور تصوف کے علمی وفکری سرمائے کے متعلق بھی بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ قرآن سے زیادہ فلسفۂ اشراق کی ترجمانی کرتا ہے، یہ طبقہ اپنے ثبوت میں صوفیہ کی کتابوں کے وہ اقتباسات پیش کرتا ہے جو بادی النظر میں قرآنی تعلیمات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، حضرت شاہ بدرالدین رحمۃ اللہ علیہ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے تصوف کی امہات کتب میں اس تدلیس، اضافے اور مسخ حقائق کی مدلل نشاندہی کی ہے، جو ہر عہد میں ہوتی رہی ہے، تدلیس وتلبیس کی یہ نشاندہی آپ کے عمیق مطالعہ، وسعت نظر اور اجتہادی بصیرت کا

پتہ دیتی ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی کی بیشتر تصانیف خصوصاً فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کا شمار تصوف کی اعلیٰ ترین کتابوں میں ہوتا ہے، ان کے متداول نسخوں کے سرسری اور سطحی مطالعے نے بے شمار مغالطے پیدا کئے ہیں، عقائد صوفیہ پر حرف گیری کرنے والے ان ہی نسخوں کی عبارتوں سے استدلال کرتے ہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق کرکے ان غلطیوں کو واضح کیا، اور فرمایا،

یہ سارے مضامین غلط ہیں، اور شیخ اکبر کا دامن اس سے پاک ہے، اس قسم کے ہفوات بدمذہبوں نے ان کی تصانیف میں بڑھادی ہیں، جیسا کہ امام عبد الوہاب شعرانی کتاب الیواقیت والجواہر ص میں لکھتے ہیں:

وجمیع ما عارض کلامہ ظاھر	ان کا وہ سارا کلام جو ظاہر شریعت
الشریعۃ وما علیہ الجمھو	اور جمہور کے خیال کے معارض
فھو مدسوس علیہ کما	ہو تو وہ پوشیدہ بڑھایا ہوا ہے
اخبرنی بذالك سیدی	جیسا کہ میرے سردار شیخ ابوطاہر
ابوطاھر المغربی نزیل مکۃ	مغربی نے اس کی خبر دی وہ مکہ
المشرفۃ ثم اخرج لی	مشرفہ میں وارد تھے، بعد اس کے
نسخۃ الفتوحات التی	انھوں نے میرے دکھانے کے لئے
قابلھا علی نسخۃ الشیخ	فتوحات کا نسخہ نکالا جس کا انھوں
التی بخطہ فی مدینۃ	نے اس نسخہ سے مقابلہ کیا تھا جو

قونیہ فلم ار فیھا مما لنت	خط شیخ کا لکھا ہوا شہر قونیہ میں
وقفت فیہ وحذ فتہ	ہے، میں نے اس چیز کو اس میں نہ
حین اختصرت الفتوحات	دیکھا، جس پر توقف میں نے کیا تھا
	جب میں نے فتوحات کا اختصار
	کیا تو اس کو حذف کر دیا،

اس کے بعد بدمذہبوں کے فریب کو بیان کیا گیا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مرض موت میں ان کے تکیہ کے نیچے برے عقائد پوشیدہ لکھکر رکھدیئے تھے، اگر ان کے اصحاب ان کے عقیدۂ صحیحہ سے واقف نہ رہے ہوتے تو بڑا فتنہ ہو جاتا۔

صاحب قاموس مجد الدین فیروز آبادی کے نام سے امام ابو حنیفہ کے رد میں اور ان کی تکفیر میں ایک کتاب پوشیدہ رکھ کر ابو خیاط یمنی کو دی انھوں نے شیخ مجد الدین کے پاس اس کو بھیجدیا، اور ملامت کی، شیخ مجد الدین نے لکھا کہ اس کتاب کو جلادو میرے دشمنوں نے مجھ پر افترا کیا ہے، میں امام ابو حنیفہ کے عظیم معتقدین میں سے ہوں ان کے مناقب میں ایک کتاب میں نے لکھی ہے،

امام غزالی کی احیاء العلوم میں بہت سے مسائل کی تحریف کر دی، ایک نسخہ اس قسم کا قاضی عیاض کے ہاتھ پڑا جس کو دیکھ کر انھوں نے اس کتاب کو جلادیا پھر اپنی کتاب البحر المورود کی نسبت لکھا ہے کہ اس میں کچھ برے عقائد لکھکر تین برس تک مکہ مکرمہ اور مصر میں مغربی لوگ شائع کرتے رہے، حالانکہ میں اس سے بری ہوں خلاصہ مطلب یہ کہ شیخ اکبر کی طرف جتنے ایسے مسائل منسوب کئے جاتے ہیں جو کتاب وسنت اور جمہور اہلسنت کے خلاف ہیں، وہ شیخ اکبر پر افترا اور بہتان

ہیں، خواہ وہ فصوص میں ہوں یا فتوحات میں یا اور کسی تصنیف میں۔"

سائلین کے جواب میں ان امور کے متعلق حضرت کے محققانہ بیانات سے ساری غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، ان مسائل پر اس وسعت سے کلام فرمایا ہے کہ ایک کتاب تیار ہو گئی ہے، جو فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کے مطالعہ کے لیے ایک محققانہ مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے، ان جوابات کے جامع اور وسیع علمی مواد کے پس منظر میں عرفانی علوم کی تمام کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، آپ کبھی سائل کے سوال کو اس کے الفاظ کی ظاہری سطح پر نہ رکھتے بلکہ تجزیہ کر کے اس کے تمام مضمرات و مقدرات کی بھی تشریح فرما دیتے اور کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جاتا تحقیق کا یہی بلند معیار متصوفانہ شعور کی تربیت میں بھی نمایاں تھا، کسی عارفانہ نکتہ کو ذہن نشین کراتے ہوئے اکابر کے اقوال کی توضیح اور رفع تعارض و تطبیق کے بعد اپنی منفرد تحقیق بیان فرماتے اور اس تحقیق کا مدار قرآن یا سنت نبوی پر ہوتا، محقق شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے حضرت کی تحقیقات میں بھی اکثر ایسے مقامات آتے ہیں کہ آپ اقوال اکابر کے ناقدانہ مطالعہ کو داعیۂ تحقیق تصور فرماتے ہیں۔

ہر چند کہ آپ مسلکاً حنفی تھے، مگر فقہی احکام و جزئیات میں تقلید محض کے بجائے اجتہاد سے کام لیتے تھے، علمائے اصول نے تحقیق مناط کے لیے مصالح و علل اور اسرار شریعت کے جس حکیمانہ ادراک کو ضروری قرار دیا ہے وہ آپ کو حاصل تھا، آپ کے اجتہادی فتاویٰ میں ائمہ فقہ و اصول کی دقت نظر اور نکتہ رسی نمایاں ہے،

آپ کے شیخ بیعت حضرت نصرؒ قدس سرہ بھی اسی بلند منصب پر فائز تھے، اور کبار علماء انکی اس جلالت شان کے معترف تھے، صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کے اس امتیاز کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں مجتہد فی المسائل لکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اولیاء کرام اپنے تزکیہ باطن، فہم رسا اور تفقہ کی بنا پر براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے اقتباس نور کرتے ہیں، اور حدود اللہ سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، کامل اتباع سنت اور دینی استقامت کی بنا پر ان کو ایسی بصیرت حاصل ہو جاتی ہے، کہ وہ شریعت میں بلحاظ طریق اجتہاد اور تفریع احکام کر سکیں، عرفاء طریق صرف ان ہی امور میں تقلید کرتے ہیں، جنکی صراحت شریعت نے کر دی ہو، یا جن پر اجماع ہو چکا ہو۔

علامہ عبدالوہاب شعرانی کہتے ہیں۔

واعلم رحمک اللہ تعالیٰ
ان حقیقۃ الصوفی فقیہ
عمل بعلمہ لا غیر علی
دقائق الشریعۃ واسرارھا
حتی صار احدھم مجتہدا
فی الطریق و الاسرار
کما ھو شأن المجتہدین
فی فروع الشریعۃ لذلک
شاعوا فی الطریق
لاجتہاد و مھمات

جان لو خدا تم پر رحم کرے صوفی درحقیقت
فقیہ ہوتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرتا ہو اسکے
سوا کچھ نہیں پس اللہ تعالیٰ اس کو اپنے
علم کا وارث گردانتا
ہے، اور دقائق شریعت اور
اس کے اسرار کی اطلاع دیتا
ہے، یہاں تک کہ ان میں کا
کوئی ایک طریقت اور اسرار
کا مجتہد ہو جاتا ہے، جیسا کہ فروع
شریعت میں مجتہدوں کی شان

ومندوبات ومکروہات وخلاف الاولی کما ہو شان المجتہدین زائدا علی ما صرحت بہ الشریعۃ واجمع علیہ الامۃ فما من احد منہم حق لہم قدم الولایۃ الا ہو مجتہد فی الطریق لیس عندہ تقلید الا بما صرحت بہ الشریعۃ واجمع علیہ الامۃ۔[۱]

ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے وہ راہ طریقت میں واجبات، محرمات، مندوبات اور مکروہات نیز خلاف اولیٰ طے کرتا ہو اور یہ شریعت کی صراحت سے زیادہ ہوتے ہیں، جس طرح اسی کے مانند دوسرے مجتہدین کیا کرتے ہیں، ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا قدم ولایت میں قائم وثابت ہو، اور وہ مجتہد نہ ہو، اس کے لیے تقلید سوائے ان امور کے جن کی شریعت نے صراحت کر دی ہے، یا جس پر اجماع ثابت ہے، جائز نہیں۔

(باقی)

[۱] الیواقیت والجواہر ص ۱۱ مطبوعہ مصر

مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی وادبی خدمات

از

عشرت افروز ایم - اے، کراچی

(۲)

الہلال کی ادارت

بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کا زمانہ ہندوستان کے لئے بہت ہی ہنگامہ خیز تھا، اس زمانہ میں تمام ہندوستان طرابلس کی جنگ کے ہنگامہ سے پرشور ہو رہا تھا، اسی کے بعد بلقان کی لڑائی شروع ہو گئی جس سے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسیات کا نقطۂ نظر بدل گیا، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سید صاحب موصوف بھی علمی مشاغل چھوڑ کر سیاست کے میدان میں اُتر آئے مولانا شبلی مرحوم اسلامی سیاسیات میں اتحادِ اسلامی پر ایمان رکھتے تھے، اور وہ سب سے پہلے مسلمان عالم تھے جنھوں نے اسی جذبہ میں ۱۸۹۶ء میں ٹرکی کا سفر کیا تھا یہی اثر اُن کے شاگردوں پر تھا جب ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال نکالا، تو اس کی آواز گویا مولانا شبلیؒ کے دل کی آواز تھی، اس لئے سید صاحب موصوف ندوہ سے درس و تدریس اور الندوہ کی سب اڈیٹری چھوڑ کر الہلال کے اسٹاف میں جون ۱۹۱۳ء میں داخل ہو گئے، الہلال میں ادارہ کی طرف سے جو مضامین شائع ہوتے تھے، ان میں لکھنے والوں کے اسمائے گرامی درج نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں سید صاحب موصوف کے کتنے مضامین شائع ہوئے، مگر ان کے جن مضامین کا پتہ چلا ہے،

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مضامین کو لکھتے وقت وہ ابوالکلام کے انداز تحریر سے متاثر تھے، الفاظ کی شوکت، بیان کی جزالت، اور تحریر کا خطیبانہ انداز وہی ہے، جن کی وجہ سے مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کر لی،

۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے کچھ حصے شہید ہوئے تو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ایک آگ لگ گئی، سید صاحب موصوف نے بھی متاثر ہو کر الہلال میں ایک بہت موثر مقالہ "شہید اکبر" کے عنوان سے لکھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے اس مقالہ کو سیاہی سے لکھنے کے بجائے خونِ جگر سے تحریر کیا ہے: الفاظ کے بجائے کاغذ کے صفحے پر اپنے لخت ہائے جگر بکھیر دیئے ہیں، ہر ہر سطر میں اندوہ و غم، رنج و الم کرب و بے چینی کا ایک طوفان بپا نظر آتا ہے، ملک میں اس مضمون کی اشاعت سے تہلکہ مچ گیا، یہ اس قدر پرجوش تھا کہ حکومت نے اس کو ضبط کر لیا، اور الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی، مگر اس کا طرزِ بیان اس قدر مختلف تھا کہ خود مولانا شبلی اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ یہ سید صاحب کے رشحات قلم کا رہین منت ہے، (دیکھو مکاتیب شبلی ص ۹۶)

شہید اکبر کے عنوان سے ایک مضمون

اس مقالہ کی ابتدا فارسی کے کچھ اشعار پھر کلام پاک کی آیتوں سے ہوتی ہے، اس کے بعد سید صاحب رقمطراز ہیں:-

"زمین پیاسی ہے اس کو خون چاہئے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا: طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے، مغرب اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے، مسلمانوں کا، ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے، خون چاہتی ہے، کس کا؟ مسلمانوں کا، آخر کار سرزمین کانپور پر خون برسا، اور ہندوستان کی خاک سیراب ہو گئی"

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"مسلم ہستی تو اب کہاں بسے گی کہ تیرے لئے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں!

وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی حکومت کہتی تھی، وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے،

لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے، وہ تیری محبت و وفاداری کا امتحان لیتی ہے"

ع:- ہندوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہمالیہ تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے، تو تیز و تند ہوا کو روک دیتا ہے، تو پُرغیظ و غضب بادل کو ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے، کیا تو ہمارے شدائد و مصائب کا طوفان نہیں روک نہیں روک سکتا، کیا تو ہمارے خون و غم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا ہو"

شہید اکبر کی تصویر کھینچے ہیں:-

"وہ نہایت عجیب منظر تھا، جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، باچشم نم، و بادل پُرغم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بے کسی کا نشان تھا کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی، اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقتِ تعمیر کعبہ ابراہیم اور اسماعیل کی زبان پر جاری تھی یعنی پروردگار اپنے گھر کیلئے ہماری ان چند اینٹوں کو قبول کر، تو سن رہا ہے، اور جان رہا ہے،

یہ پُراثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں ایک مختصر سوار اور پیدل فوج اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے، پردہ جب چاک ہوتا ہے، میدان میں خاک و خون

یہ منا تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں، جن میں بعض جانیں بھی ہیں، جو افسوس دم توڑ رہی ہیں۔

آگے چل کر ساری قوم کی طرف سے مقتولین کا ماتم کرتے ہیں:۔

"ہندوستان لرزتا ہے کون ہے جو اس کو تھامے؟ ہندوستان مضطرب ہے، کون ہے جو اس کو تسکین دے؟ ہندوستان وقفِ فریاد ہے، کون ہے جو اس کی فریاد رسی کو آمادہ ہو،

مقتولین کانپور تم پر نماز نہیں پڑھی گئی، کہ تم مغفور تھے، ہم گنہگار تمہاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے، لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن نہیں ملا، گولیوں اور بندوقوں کے قطع و برید کے بعد تمہارے جسم اسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے، غزوۂ بنی لحیان میں شہدائے اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھالی تھیں، ہم آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ اخفائے راز کے لئے اگر پولیس نے تمہاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں نہیں دفن کیں تو یقیناً تمہاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھا لیا کہ رضوانِ الٰہی ان کا منتظر تھا،

مجروحین کانپور تم نے گولیاں کھائی ہیں، نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے، تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں، تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے، تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا، جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا،

ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا"

"معصوم بچو! اور ریاضِ اسلام کے نو دمیدہ غنچو! تمہیں کس نے مرجھا دیا، جمہور مسٹن کے الفاظ طعن نے تمہارے بے گناہ و ناآشنائے جرم دلوں کو مضطرب کر دیا، تم اٹھے کہ اپنے دہن زخم سے اس الزام کی تکذیب کرو۔ اے طائرانِ قدس اڑ جاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمہاری منتظر ہیں۔

اخبار کے سیاہ حرفوں میں ہمارے لئے تنبیہ و عبرت نہ تھی، قدرت نے خون کی سرخ تحریروں میں ہمیں نامۂ عبرت و دستور تنبیہ بھیجا، ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کو پڑھا اور اس سے تنبیہ اور عبرت حاصل کی۔"

پورا مقالہ اسی رنگ میں قلمبند کیا گیا ہے جو سید صاحب کے قلمی جوش و خروش اور حزن و ملال کی اعلیٰ مثال ہے، مگر یہ ان کا اصلی رنگ نہیں، ان کے اشہب قلم کی یہ جولانیاں آئندہ کسی دوسری تحریر میں دیکھنے میں نہیں آئیں، وہ الہلال کی ادارت میں شامل تھے اس لئے الہلال کے اور مضامین کے رنگ میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھا گئے۔

الہلال میں سید صاحب کے اور بھی مضامین شائع ہوئے، وہ خود کراچی کے رسالہ مستقبل (اکتوبر ۱۹۴۹ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

"الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے اس لئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعوں کے شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام صاحب کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں، الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل اور شہید اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں۔"

اخبار مدینہ (بجنور) کے ایک بنگلوری مضمون نگار نے اس کے بیسیوں کالم سیاہ کر کے

یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ شہدِ اکبر کا مضمون سید صاحب کا ہو نہیں سکتا، سید صاحب کے شاگردوں کے حلقہ میں یہ مضمون پڑھا جاتا تھا، اور ایک خاص قسم کی ہنسی کے ساتھ اس کو علیحدہ کر دیا جاتا تھا، کہ قلم کا اگر سینہ واقعی ہوتا تو اس کو قلم کی سینہ زوری ہی کہا جا سکتا تھا، کچھ اور حلقہ میں یہ بحث چلی تھی کہ شہدِ اکبر کس کا مضمون ہے، شہد اکبر کوئی ایسا مضمون نہیں جو اگر سید صاحب سے چھین لیا جائے، تو ان کے رتبہ میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی، یا اگر یہ مولانا ابوالکلام سے منسوب کر دیا جائے، تو ان کا رتبہ اس سے زیادہ اونچا ہو جائیگا، جیسا کہ ان کا واقعی ہے،

الہلال کے، اور دوسرے مضامین میں سید صاحب کی تحریر کا یہ رنگ تھا،

دنیا اسی تعبد و غلامی اور ذلت و تحقیر میں تھی کہ بحر احمر کے سواحل پر ریگستانی سرزمین میں ایک عربی بادشاہ کا ظہور ہوا جس نے اپنے معجزانہ زور و توانائی سے قیصر و کسریٰ کی بنیادیں ہلا دیں، تعبد و غلامی کی زنجیریں اس کی شمشیر خارا شگن کی ایک ضرب سے کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں، اور استقلال ذات و فکر، حریت خیال و رائے شرف و احترام نفس، مساوات، حقوق اور ابطال شاہنشہی کی روشنی دنیائے قدیم کے قلب سے نکل کر دنیا میں پھیل گئی، شاہانِ عالم مرتبۂ قدوسیت سے گر کر عام سطحِ انسانی پر آگئے، اور عام انسان سطحِ غلامی و حیوانیت سے بلند ہو کر مصر و بابل کے دیوتاؤں اور روم و ایران کے قیصر و کسریٰ کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو گئے، اور بقول مشہور مؤرخ گبن: قوائے عمل و زندہ دلی جو صومعوں اور خانقاہوں میں پڑی سوتی تھیں عسکرِ حجاز کی آواز دہل سے چونک پڑیں، اور اسلام کی اس نئی سوسائٹی کا ہر ممبر جب استعداد فطرت و حوصلہ اپنے مرتبے پر پہونچ گیا،،

(الحرب فی الاسلام ۲ر جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۱۰، ۹)

اوپر کے اقتباس میں جہاں سید صاحب کے حب رسول کا اظہار ہوتا ہے، وہاں ان کے قلم کا زور بیان بھی عیاں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں قدرت کی طرف سے اس لئے ودیعت ہوئی تھیں، کہ وہ سیرۃ النبیؐ کے مصنف بن کر دینی اور دنیاوی سعادت حاصل کریں،

دکن کالج پونہ میں لکچراری

حضرت سید صاحب الہلال کے اسٹاف میں زیادہ دنوں نہیں رہے وہاں سے وہ دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کے لکچرار مقرر ہو کر چلے گئے، اسی زمانہ میں نواب سلطان جہان بیگم والئیہ بھوپال نے سیرۃ عائشہؓ لکھنے کی فرمائش کی، یہ کام مولانا شبلی نے سید صاحب موصوف کے سپرد کیا، اس سلسلہ میں لائق شاگرد کو لائق استاد کی یہ نصیحت تھی کہ

"حضرت عائشہؓ کے اجتہادات نقلی اور کلامی کو زور کے ساتھ لکھنا چاہئے، یعنی طرز استدلال اور بیان اور عبارت سب پر زور ہو" (مکاتیب شبلی ص ۱۰۰)

اسی نصیحت کو ذہن میں رکھ کر آئندہ چل کر سیرۃ عائشہؓ لکھی گئی، اور جب سید صاحب نے اپنی مشغولیتوں کی بنا پر سیرت عائشہؓ لکھنے کے کام کو اپنے دوست مولانا عبدالسلام ندوی کے حوالہ کرنے کو لکھا تو مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ

"ان کی (یعنی مولوی عبدالسلام کی) زبان ادب آشنا نہیں"

ان الفاظ میں یہ سید صاحب موصوف کی تحریر اور انشاء کی تعریف تھی، اور یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کی تحریر زبان، ادب، تہذیب، سنجیدگی، متانت اور وقار کی حامل ہوتی، اور یہی ان کی انشاء پردازی کا سب سے بڑا وصف ہے، سید صاحب موصوف کے اسی وصف کی بنا پر مولانا شبلی اپنے ایک مکتوب میں اپنے محبوب شاگرد کو لکھتے ہیں،

"افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے، کبھی تم اور دنیا کے تمام کاموں سے

فارغ ہونا تو تمھیں لکھنا" (۱۸ر فروری ۱۹۱۴ء)

مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی سوانح نگار مولوی نذیر احمد مرحوم، مولانا شبلیؒ کی سوانح لکھنا چاہتے تھے، سید صاحب سے مولانا شبلی کے حالات پوچھے تھے، سید صاحب نے ان کی سفارش مولانا شبلی سے کی تھی، مذکورۂ بالا مکتوب اسی کے جواب میں لکھا گیا ہے، سید صاحب موصوف نے اپنے استاد کی اس وصیت کو اب پورا کر دیا ہے، جیسا کہ آیندہ صفحات میں ذکر آئے گا،

مئی یا جون ۱۹۱۴ء کے مشرق گورکھپور میں ایک بزرگ نے مولانا شبلی پر اعتراضات کا سلسلہ لکھنا شروع کیا تھا، اس کے جواب میں سید صاحب موصوف نے ایک مضمون لکھا، اس سلسلہ میں مولانا شبلی سید صاحب موصوف کو لکھتے ہیں،

"مشرق کا مضمون تو بہت ہی زور اور پُر از لطافت ہے"

(۱۵ر جولائی ۱۹۱۴ء مکاتیب شبلی ص ۱۱۳)

سید صاحب موصوف کی علمی و ادبی صلاحیت کی یہ سند استاد نے اپنی وفات سے چند مہینے پہلے دی، اور آگے چل کر زمانہ نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ سید صاحب کے ہر مضمون اور اُن کی ہر تصنیف کی تحریر پر زور اور پُر از لطافت دونوں رہی،

دار المصنفین، اعظم گڈھ کا تخیل

مولانا شبلی اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے ایک علمی ادارہ قائم کرنے کے لئے بہت بے تاب اور مضطرب تھے، انھوں نے ۱۹۱۰ء کے دار العلوم ندوہ کے سالانہ اجلاس میں اپنی رپورٹ میں یہ تجویز پیش کی تھی، کہ ایک ایسا کتب خانہ جمع کیا جائے، جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم و فنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں

موجود ہوں، جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدما کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو، بلکہ وقف عام ہو تاکہ ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہلِ قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں، اس قسم کا کتب خانہ قائم کرنے اور اس کے ساتھ ایک علمی جماعت پیدا کرنے کی لگن مولانا شبلی کے دل میں اس لئے بھی پیدا ہوئی کہ وہ اردو کا دامن اسلامی علوم و فنون سے بالکل خالی پا رہے تھے، علوم دینیہ میں مثلاً تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، تصوف اور کلام پر اردو میں کوئی عمدہ، مستند اور جامع تصنیف نہیں تھی، مسلمانوں کے لٹریچر، مسلمانوں کے تہذیب و تمدن، مسلمانوں کی تاریخ، مسلمانوں کے فلسفہ، مسلمانوں کے طبیعیات، اور مسلمانوں کے جغرافیہ وغیرہ پر اردو زبان میں تحقیق و ریسرچ کرنے کا کوئی سامان میسر نہ تھا، یورپ کے مستشرقین اسلامی علوم و فنون پر پرانی کتابیں شائع کر کے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دے رہے تھے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تحقیق و تدقیق کے پردہ میں اسلام، داعیٔ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن پر خوش اسلوبی سے حملہ کر کے سخت نقصان بھی پہنچا رہے تھے، مولانا شبلی اس زہر کا تریاق پیش کرنا چاہتے تھے، چنانچہ ان تمام مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک علمی ادارہ دار المصنفین کے نام سے قائم کرنے کی فکر میں تھے، مگر ملک کی عام ناقدردانی، اور مالی ذرائع کی کمی کی وجہ سے اپنے حوصلہ کو عملی جامہ پہنانے میں پس و پیش کر رہے تھے، لیکن پھر بھی ہمت کر کے اپنی اس تجویز کو ۱۹۱۴ء میں الہلال کلکتہ کے ذریعہ ملک کے سامنے پیش کیا، ارباب علم کے حلقہ میں تو اس تجویز کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی، مگر اصحابِ ثروت کی توجہ بہت زیادہ مبذول نہیں ہوئی، لیکن مولانا شبلی اس ادارہ کی تاسیس کے لئے بے چین تھے، چنانچہ اس کے لئے اپنے وطن اعظم گڈھ میں اپنا ایک وسیع باغ اور دو کچے بنگلے وقف کئے، تاکہ یہی ویرانہ "ہندوستان کی علمی کوششوں کا جولانگاہ بنے

اپنے خاص کتب خانہ کی کتابیں بھی اس ادارہ کو منتقل کردیں، اور اس کا ایک خاکہ تیار کرکے اس کے لئے موزوں کام کرنے والوں کا انتخاب کر رہے تھے، کہ ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے،

استاد کی آخری وصیت

اپنے انتقال پر ملال سے پہلے مولانا شبلی سیرت نبوی لکھنے میں مشغول تھے، پہلی جلد لکھ چکے تھے، دوسری کی ابتدا کی تھی کہ مرض الموت میں مبتلا ہوگئے، اور جب اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے، تو سیرۃ نبوی کے تمام مسودے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کروا دیئے، اور عزیزوں کو وصیت کی کہ "یہ مسودے حمیدالدین اور سید سلیمان کے سپرد کئے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیئے جائیں" پھر اپنے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان کو پونہ سے تار دے کر بلایا کہ ان کو سیرت نبویؐ کا پورا پلین سمجھا دیں، سید صاحب موصوف جب استاد کے پاس پہونچے تو وہ خود حیات شبلی میں لکھتے ہیں:

"آہ! جب ۱۵/ نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا، اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا، کہ "اب کیا رہا" پھر زبان سے دوبارہ فرمایا، "اب کیا، اب کیا" لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا، تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی، تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا، "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کردو" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ضرور ضرور! اور جب اور بھی حالت خراب ہوگئی، تو زبانِ مبارک سے تین مرتبہ سیرت، سیرت، سیرت، کہا اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا: "سب کام چھوڑ کے"

نوحۂ استاد

شفیق استاد کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تو محبوب شاگرد پر بے حد اثر ہوا، چنانچہ اپنے اندوہگیں تاثرات کا اظہار حسب ذیل نوحہ میں کیا ہے،

اے متاعِ عزت پیشیں کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

شامِ اقبال گذشتہ مقطعِ عہدِ سلطنت
شمعِ بزمِ صحبتِ آخر، نشانِ رفتگاں

غنچۂ فصلِ بہیں موجِ نسیمِ صبحِ دم
نغمۂ آخر سحر، مرغِ گلستانِ خزاں

علم و فن کا عشق تھا جسکی طبیعت کا خمیر
صفحۂ قرطاس جس کا فخرِ قومی کا نشاں

جس کے لب کی جو صدا تھی نوحۂ اسلاف تھی
جس کی ہر فریاد تھی صوتِ درائے کارواں

جس کی ہر رائے رزیں آزارِ ملت کا علاج
جس کی ہر تجویز قومی زندگی کی پاسباں

جس کی اک اک بات تھی روحِ بلالی کی اذاں
جس کی رگ رگ میں تھیں سفودردکی چنگاریاں

جس کے ہر مصرع میں سوز آتشِ زخمِ دروں
جس کے ہر فقرہ میں مخفی مراہم دردِ نہاں

جس کے خامہ کی روانی میں نہاں دردِ فراق
جس کے ہر صفحہ کا دامن رشکِ دریائے عماں

ہیکلِ آرائے سخن جس کا دماغِ نکتہ در
مرکبِ پروازِ معنی جس کی پانچوں انگلیاں

اب ہمیشہ کے لئے وہ آہ ہم سے چھٹ گیا
وائے ناکامی ہمارا قافلہ اب لٹ گیا

کیا فریبِ صبر کھائے غم نصیب دلفگار
جس کی دولت لٹ گئی کب اسکو دل پر اختیار

جانتا ہوں ہر بشر کو رہروِ عاجل سفر
جانتا ہوں زندگی کو اک لباسِ مستعار

جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا
پھر دلِ اندوہگیں کو کس طرح آئے قرار

یاد آئے جب وہ اس کا فقرۂ نا مختتم
"آہ سیرت! آہ سیرت! چھوڑ دو سب کاروبار"

اس طرف لب توصیہ فرمائے تکمیلِ عمل
اس طرف جاں مبتلائے نزع و رنجِ احتضار

پھوڑ کے کس طرح پرشور ہی قلبِ مضطرب
کس طرح رک جائے خونِ نابِ چشمِ اشکبار

اے سروشِ موت! اک لمحہ توقف کر کہ میں
پوچھ لوں "اے احمدِ مختار کے سیرت نگار"

تیرے اوراقِ پریشاں کس طرح ترتیب دوں
کچھ طریقِ نقد سکھلا، کچھ بتا اندازِ کار

جب سوادِ خط تر آئے گا آنکھوں کو نظر
کس طرح پائے گا قلبِ مضطرب صبر و قرار

اہلِ میت اک توقف! پوچھ لوں آقا سے میں
"میرے آقا میں فدا، اور جاں مری تجھ پر نثار

تو نے فرمایا کہ تاریخِ عرب تحریر ہو
(ارض القرآن)
ہو چکی تکمیل، اب ہو کون دیباچہ نگار"

پھر تسکینِ دلِ بے صبر کچھ فرمائیے
میرے آقا پھر ذرا اعجازِ بیاں دکھلائیے"

کون اب بتلائے مجھ کو طرزِ اعجازِ بیاں
کون پھونکے اب مرے بے جان سے فقروں میں جاں

مرکزِ امید جو تھا آج وہ جاتا رہا
جذبۂ شوقِ زیارت اب مجھے کھینچے کہاں

اب پرِ پروازِ معنی کون بخشے گا مجھے
پستِ مضموں کون پہنچائے گا اب تا آسماں

کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن
کون سمجھائے گا رمزِ حسنِ اسلوبِ بیاں

کون دیکھے گا مرا اب زورِ بازوئے قلم
کون دیکھے گا مری جولانیٔ طبعِ رواں

کون نامہ میں کرے گا اب عزیزی سے خطاب
کس کا قلم "کتنا بڑھائے گا مری توقیر و شاں"

کس کے نامہ کا بتاؤں اب میں عنوانِ خطاب
"سیدی" "مولائی" "استاذی" "غزالی الزماں"

اس کی مجلس تھی تماشا گاہِ اربابِ نظر
آہ اے دستِ اجل تو نے مٹایا وہ سماں

میں نے جب پوچھا بتائے اس نے ہر فن کے رموز
اب اگر چاہوں تو ڈھونڈوں آہ کس کا آستاں

جب اسے دیکھا نئی روحِ عمل پیدا ہوئی
اس کی باتیں جب سنیں پائی نئی تاب و تواں

اس دلِ پرشور میں گر شور تھا تو اس سے تھا
میرے بازو میں اگر زور تھا تو اس سے تھا

تیرے فرزندانِ ندوہ تیری کوشش کے ثمر
کمسنی ہے، رہ نہیں سکتے ابھی رنجِ پدر

کچھ ابھی بچے ہیں رازِ مرگ سے واقف نہیں
رو کے کہتے ہیں کہ کیوں آقا نے چھوڑا ہے یہ گھر

کیا ابھی جانیں یہ خونِ نابہ فشانی چشم کی
کس طرح سمجھائیں اُن کو صدمۂ داغِ جگر

نوجواں جو ہیں وہ کہتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو
ہو ملالِ طبع ہم سے باعثِ عزمِ سفر

کس ہوس سے تو نے اُن کی تربیت فرمائی تھی
آہ کس امید سے تو نے لگائے تھے شجر

باغباں کیا رک نہیں سکتے ہو اگلی فصل تک
لوگ کہتے ہیں کہ اب کی لائیں گے یہ برگ و بر

طاقتِ پرواز تک تاخیر کرنی تھی ضرور
اب نکل آنے لگے تھے بازوؤں پر بال و پر

جب کبھی باہر ہوا جانا تو اُن سے مل گئے
وعدۂ دیدار کیوں اٹھا ہے اب کی حشر پر

ان کی خاطر سے ہوئے اکثر ارادے ملتوی
ملتوی ہو جائے کچھ دن کے لئے عزمِ سفر

اور اگر کارِ ضروری ہے تو ٹل سکتا نہیں
عرض اتنی ہے کہ ہو اُن کی یتیمی پر نظر

اپنے بچوں کا کوئی سامان کرنا تھا ضرور
پھر خدا جانے کہ ملنا کب ہو اور جانا ہو دور

تو نے جب چھیڑا ہے کوئی سخت یا آسان کام
نا پسند آیا ہے اُس کو چھوڑ دینا ناتمام

مقصدِ اعظم ترا یعنی بنائے درسگاہ
جس میں طرزِ نو سے ہو تعلیمِ فن کا انتظام

شائقِ فن کے لئے سامانِ تکمیلِ علوم
اور اک چھوٹی سی تصنیفی جماعت کا قیام

تھے ابھی پیشِ نظر کچھ اور قومی مسئلے
نشرِ دیں، تعطیلِ جمعہ، انتظامِ وقفِ عام

ان مقاصد کے علاوہ اور بھی تھے کچھ امور
تیرے ہاتھوں سے ابھی پانا تھا جن کو انصرام

کام ادھورے ہیں بہت پھر کیوں ہوا عزمِ سفر
اس قدر تو ہو توقف ان کا بن جائے نظام

لوگ [illegible] میں جنازہ [illegible] پوچھ لوں بھولا نہ ہو

کوچ ہوتا ہے جہاں سے قوم کے غمخوار کا | کون ہو اب چارہ ساز اس ناتواں بیمار کا

شغل دائم جس کا تھا غمخواری دین مبین | اب وداع دائمی ہوتا ہے اُس غمخوار کا

وقفِ ماتم جو رہا جب تک اُس میں جان رہی | کون اب ماتم کرے اس جانِ ماتم کار کا

سوگوار اپنے بزرگوں کا رہا جو عمر بھر | کون ہو اب سوگوار اس سوگوار زار کا

خون روئے جس نے قومی بیکسی پر تیس سال | نوحہ گر ہو کون اب اس دیدۂ خونبار کا

تھا صفِ میدانِ ملت کا وہی شمشیر زن | عرصۂ ہیجا میں ہو کون اب حریف اغیار کا

دل نہ تھا پہلو میں اُس کے پارۂ سیماب تھا | یا سراپا زخم خوردہ درد کی تلوار کا

چارہ گر آزارِ قومی کا جو تھا رخصت ہوا | مُدعی کو ہے صلا! اب چارۂ آزار کا

نے نوا زد داستانِ غم نہ تھی اُسکی زباں | اک ترانہ تھا دہن میں لحنِ موسیقار کا

عالمِ اسلام میں تھا اک ہی روشن دماغ
آہ! اس تاریک خانہ کا وہی تھا اک چراغ

اردو زبان میں سید صاحب نے پہلی دفعہ شعر و شاعری میں طبع آزمائی کی، دل کی آواز تھی اس لئے آواز میں غم و الم، رنج و اندوہ کی پوری تاثیر ہے، اور استاذ مرحوم سے جتنے فیوض برکات حاصل کئے تھے، اُن کی بھی مکمل تصویر ہے، عزیز لکھنوی نے اس نوحہ پر داد دی، مگر ایک شعر کے لفظ "برس" (بہ سکون الرار) پر اعتراض کیا، کہ برس (بہ فتح الرار) کے ساتھ اگر مصرع پڑھا جائے، تو یہ موزوں نہیں ہوتا، اور انھوں نے یہ بھی بتایا کہ صحیح لفظ برس (بہ فتح الرار) ہے برس (بہ سکون الرار) صحیح نہیں،

سید صاحب نے اس مشورہ کو قبول کر کے اس لفظ کو اپنے شعر سے نکال دیا، نواب عماد الملک مولانا سید حسین بلگرامی نے بھی اس نوحہ کی تعریف کی، مگر انھوں نے سید صاحب موصوف کو یہ بھی مشورہ دیا، کہ علمی بازار میں کوئی علمی چیز اسی وقت پیش کی جائے، جب یہ یقین ہو کہ اس بازار میں اس سے بہتر چیز پیش نہیں کی جا سکتی، اس رائے پر سید صاحب موصوف نے عمل کیا، اور مشق سخن کو جاری نہیں رکھا، یوں کبھی کبھی طبیعت موزوں ہو جاتی تو کچھ اشعار موزوں کر لیتے،

قیام دار المصنفین

استاد کی وفات کے بعد سید صاحب نے غیر معمولی ایثار سے کام لیا، پونہ کالج کی لکچراری سے مستعفی ہو کر استاد مرحوم کی وصیت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوشاں ہوئے، چنانچہ ان کی وفات کے بعد چھ سات مہینے کے بعد جون ۱۹۱۵ء میں دار المصنفین (جو انگریزی میں شبلی اکاڈمی کے نام سے بھی مشہور ہے) قائم ہوا، اور اس کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے،

(۱) ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہلِ قلم کی جماعت پیدا کرنا (۲) بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ (۳) اُن کی اور دیگر علمی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سامان کرنا،

حضور نظام نے اس کی مالی سرپرستی قبول فرمالی،

اس کی مجلس انتظامیہ کی صدارت نواب عماد الملک بہادر سید حسین بلگرامی کو تفویض ہوئی، اور خود مولانا سید سلیمان ندوی اس کے ناظم مقرر ہوئے،

تیسرا دور

رسالہ معارف کا اجرار

دار المصنفین قائم ہوا، تو سید صاحب کو سب سے پہلے استاد مرحوم کی آخری وصیت یعنی سیرت کی تکمیل کی فکر ہوئی، مگر ادارہ کو بھی ملک میں نمایاں ممتاز اور مقبول بنانا تھا، اس لئے اس کی آواز کو قوم تک پہنچانے کے لئے اس کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ معارف بھی جاری کیا، جو ۱۹۱۵ء سے اب تک یکساں آب و تاب کے ساتھ نکل رہا ہے، یہ رسالہ اپنی غیر معمولی متانت، سنجیدگی، بلند پایہ تحقیقی مضامین اور اعلیٰ طرز نگارش کی وجہ سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں سب سے زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، سید صاحب موصوف کی

شخصیت معارف کے پرچوں میں نمایاں طور سے عیاں ہوئی، وہ اگر کسی کتاب کے مصنف نہ بھی ہوتے، تو صرف معارف کے پرچے ہی اُن کو اردو لٹریچر میں زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی تھے، اس رسالہ میں سید صاحب کے مختلف جلوے نظر آتے ہیں، کبھی تو وہ ایک صحافت نگار کے لباس میں نظر آتے ہیں، کبھی ایک ممتاز ادیب کے پیکر میں دکھائی دیتے ہیں، کبھی اُردو زبان کے بہت بڑے علمبردار کی شان میں جلوہ افروز ہوتے ہیں، کبھی ایک بے مثل مورخ کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں، اور کبھی ناقد شعر و سخن، کبھی متکلم، کبھی مفسر، کبھی محدث، کبھی صوفی اور کبھی کبھی ماہر سیاسیات بن کر اپنے ناظرین کو محظوظ کرتے ہیں، اور یہ ان کا سب سے بڑا امتیاز کہ مختلف موضوع پر قلم کی یکساں قدرت کے ساتھ گل افشانی کر سکتے ہیں، یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا، کہ اس وقت تک ادب و انشا میں اپنے استاد مرحوم کے ہم پلہ ہو گئے تھے، مگر جہاں تک علم کی گہرائی، نظر کی وسعت اور تحقیق و تدقیق، تفحص و تجسس کے معیار کا تعلق ہے، وہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے، اور اُن کے استاد مرحوم کی روح خوش ہوگی کہ ان کے محبوب شاگرد کی وجہ سے اُن کے مشن کی تکمیل ہوئی،

معارف میں مضامین ۱۶ء سے آخر وقت تک معارف میں سید صاحب موصوف نے حسب ذیل مضامین لکھے،

روزہ: ج ۱ نمبر ۱ جولائی ۱۹۱۶ء مطابق رمضان ۱۳۳۴ھ،

اکبر کا ظریفانہ کلام،

قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات،

اگست ۱۶ء ج ۱ نمبر ۲

حجۃ الملۃ والدین حضرت علامہ شبلی نعمانی

تعددۂ الشذریحیۃ، اگست ۱۶ء جلد ۱ نمبر ۲

مسئلہ انتقال جائداد بنام اشخاص غیر مولود

اگست ۱۶ء ج ۱ نمبر ۲

خواب منام و ادراک [illegible] عالم ستمبر ۱۶ء جلد ۱ نمبر ۳

کشفِ حقیقت (مسئلہ زوجۂ غیر متفق علیہا)

(اکتوبر ۱۶ء) جلد ۱ نمبر ۴،

دار المصنفین کی ایک اسلامی خدمت یعنی سیر الصحابہ کی تدوین و تالیف، جلد ۱ نمبر ۶ دسمبر ۱۶ء

اہلِ سنت والجماعت جولائی ۱۹۱۷ء

اگست ۱۷ء، ستمبر ۱۷ء

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ایک شاعر کی حیثیت سے، (اگست ۱۷ء)

زبان اُردو کی ترقی کا مسئلہ ستمبر ۱۷ء،

حسین بن منصور حلاج کی تاریخی شخصیت

(اکتوبر ۱۷ء)

مسلمانانِ ہند کی تنظیم مذہبی (بہ تقریب اجتماع فرنگی محل) (نومبر ۱۷ء)

تکملہ مقالہ اہل السنت وصایائے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (نومبر ۱۷ء دسمبر ۱۷ء)

جنگ کا فلسفہ علمائے یورپ کے دو فرقے (ترجمہ) دسمبر ۱۷ء،

ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں (تقریر جو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ

کلکتہ میں ۲۹ر دسمبر ۱۷ء کی شب کو کی گئی،) جنوری ۱۸ء

سلطان ٹیپو کی چند باتیں (کچھ چشم دید شاہدات، اور کچھ تاریخی حقائق)

(فروری ۱۸ء)

ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی، (مئی جون، جولائی، اگست ۱۸ء)

ہندو فارسی شعراء، ستمبر ۱۸ء

ہندو ادبائے فارسی، اکتوبر ۱۸ء

ہندو علمائے علوم عقلیہ، نومبر ۱۸ء

ہندو اور طب و تصوف و موسیقی و مصوری

(دسمبر ۱۸ء)

نظر بندان اسلام (بہ تقریب رہائی سید الاحرار سید فضل الحسن حسرت موہانی)

جنوری و فروری ۱۹ء

ہمارے موجودہ نظر بندان اسلام (علمی مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے) مارچ ۱۹ء

مجسمہ اور تصویر کے متعلق اسلام کا شرعی حکم، ستمبر و اکتوبر ۱۹ء

انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ
(جون سنہ ۲۰ء)
آیت استخلاف: اکتوبر سنہ ۲۰ء
خلافت اور ہندوستان دسمبر سنہ ۲۰ء
مسئلۂ خلافت:- فروری سنہ ۲۱ء
خلفاے اسلام کا اقتدار و اثر،
(مارچ سنہ ۲۱ء)
سلاطین اسلام کے بیعت نامے،
(ستمبر سنہ ۲۱ء)
خلافت آل عثمان اور ہندوستان
(اکتوبر سنہ ۲۱ء)
خلافت اسلامیہ اور دنیاے اسلام
(نومبر و دسمبر سنہ ۲۱ء، فروری، مارچ،
اپریل سنہ ۲۲ء)
علماے روس مئی سنہ ۲۲ء
خلافت عثمانیہ اور مسیحی دنیا کا اعتراف
(جون سنہ ۲۲ء)
دنیاے اسلام میں ذہنی انقلاب
نومبر سنہ ۲۲ء،

محبت الٰہی اور اسلام، جولائی سنہ ۲۳ء
ارض مقدس کی داستان، اکتوبر سنہ ۲۳ء
ارض حرم نومبر سنہ ۲۳ء
ارض حرم اور اس کی مذہبی حیثیت،
(دسمبر سنہ ۲۳ء)
ہندوستان میں اسلام کیونکر پھیلا،
(جنوری و مئی و اگست سنہ ۲۴ء
شعر العجم اور عمر خیام فروری سنہ ۲۴ء
سیرت نبوی کی ایک نظر پر نظر، اپریل سنہ ۲۴ء
بدنصیب کشمیر اور عدل شاہجہانی، اکتوبر سنہ ۲۴ء
سلاطین نجد اور ان کا مذہب نومبر سنہ ۲۴ء،
ملک عرب کی تعلیمی حالت مئی سنہ ۲۵ء،
شغل تکفیر، جولائی سنہ ۲۵ء
جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق "
عالم اسلامی کی تنظیم کا مسئلہ اگست دسمبر سنہ ۲۵ء
سیر المصنفین ستمبر سنہ ۲۵ء
اسلامی خلافت کا کارنامہ اکتوبر سنہ ۲۵
نظم ملت نومبر سنہ ۲۵
مسلمانوں کی بے تعصبی کی ایک اردو دستاویز دسمبر سنہ ۲۵

اردو کے نئے رسالے، دسمبر سنہ ۲۵ء
محمد بن عمر الواقدی جنوری سنہ ۲۶ء
احادیث و سیر کی تحریری تدوین فروری سنہ ۲۶ء
جمعیۃ العلماء کا خطبۂ صدارت مارچ سنہ ۲۶
احکام القرآن اپریل سنہ ۲۶ء
حجاز کے کتب خانے، اکتوبر، نومبر،
دسمبر سنہ ۲۶ء
پھر واقدی، جنوری سنہ ۲۷ء
مسلمان حکماء اور یونانی فلاسفہ
(فروری سنہ ۲۷ء
مسلمان عورتوں کے حقوق کا مسئلہ
اپریل و مئی و جون جولائی اگست سنہ ۲۷ء
نکاح بلا ولی اکتوبر سنہ ۲۷ء
مسئلہ حقوق نسواں جنوری سنہ ۲۸ء
مجلس العلماے مدراس کا خطبۂ صدارت
(اپریل و مئی سنہ ۲۸ء)
حقوق نسواں (کفو) جون سنہ ۲۸ء
حضرت عائشہؓ کی عمر ان کے نکاح
کے وقت کیا تھی، جولائی سنہ ۲۸ء

ہندوستان میں علم حدیث، اکتوبر، نومبر، دسمبر سنہ ۲۸
حضرت عائشہؓ کی عمر (مولانا محمد علی صاحب
لاہوری کے شبہات کا جواب) جنوری سنہ ۲۹ء
ہندوستان میں کتب حدیث کی نایابی کے
بعض واقعات، فروری سنہ ۲۹ء
ہندوکش عالمگیر کے عہد کی دو عجیب
ہندو کتابیں، جون سنہ ۲۹ء،
سُنّت: اگست سنہ ۲۹ء
مذہب کا قانونی حصہ ستمبر سنہ ۲۹ء
ہندوستان میں علم حدیث کی تاریخ کے
چند گمشدہ اوراق، اکتوبر سنہ ۲۹ء
مسلمانان ہند کا شرعی نظام دسمبر سنہ ۲۹
المحلّٰی لابن حزم مارچ سنہ ۳۰ء
پھر بحث سنت جولائی سنہ ۳۱ء
منصب نبوت اگست سنہ ۳۰ء
مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ جنوری، فروری سنہ ۳۱ء
وحی اور ملکۂ نبوت جولائی سنہ ۳۱ء
گلۂ آشنا، اگست سنہ ۳۱ء
ایمان: ستمبر، اکتوبر سنہ ۳۱ء

ایام صیام پر نظر ثانی، جنوری ۳۲ء

تحفظ حقوق زوجین، مارچ ۳۲ء

رباعی، اپریل ۳۲ء

ہندوؤں کا ایک عجیب فرقہ، جولائی ۳۲ء

حکیم سنائی کے متین عمر، مارچ ۳۳ء

اردو کیونکر پیدا ہوئی، جولائی ۳۳ء

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز، اگست ۳۳ء

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم، ستمبر و اکتوبر ۳۳ء

سفر افغانستان، دسمبر ۳۳ء، جنوری

فروری و مارچ ۳۴ء

سیرۃ النبی جلد چہارم پر تبصرہ، مارچ، اپریل ۳۴ء

غزنی کا سفر، مئی ۳۴ء

مقبرہ غزنی اور قندھار، جولائی ۳۴ء

قندھار، اگست ۳۴ء، قلعہ جدید و چمن، ستمبر ۳۴ء

کوئٹہ اور ملتان، اکتوبر ۳۴ء

ملتان سے لکھنؤ، نومبر ۳۴ء

نالندہ کی سیر، فروری ۳۵ء

عربوں کی بحری تصنیفات، مارچ ۳۵ء

توکل، اپریل ۳۵ء

صبر کا قرآنی مفہوم، مئی ۳۵ء،
جون ۳۵ء

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار،
فروری، مارچ، اپریل ۳۶ء

اسلام میں حیوانات کے ساتھ سلوک،
اگست ۳۶ء،

سفر گجرات کی چند یادگاریں،
ستمبر ۳۶ء

کتب خانہ حمیدیہ، دسمبر ۳۶ء

خطبۂ صدارت، ہندوستانی اکاڈمی
اردو کانفرنس لکھنؤ، فروری ۳۷ء

ذبح عظیم، مارچ ۳۷ء

قربانی کا اقتصادی پہلو، مارچ ۳۷ء

خلیل اللہ کی بشریت، اپریل و مئی ۳۷ء

خطبۂ صدارت شعبۂ علوم و فنون اسلامی
جون و جولائی ۳۷ء

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان،
ستمبر ۳۷ء

ہماری زبان بیسویں صدی میں، نومبر ۳۷ء

جامعہ دار السلام عمر آباد کا
خطبۂ اسناد، جنوری ۳۸ء

مقدمہ تفسیر جواہر، فروری ۳۸ء

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم،
(اکتوبر ۳۸ء)

مقالات شبلی جلد ہشتم کا دیباچہ
(دسمبر ۳۸ء)

قرآن پاک کا تاریخی اعجاز،
(فروری ۳۹ء)

عرب اور امریکہ (مارچ و
اپریل ۳۹ء)

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق،
(مئی ۳۹ء)

تمہید، جون ۳۹ء

نامۂ خسروی اور طرفۂ اختلاف نماز
(اگست ۳۹ء)

خطبۂ صدارت شعبۂ اردو مسلم
ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ،
(فروری ۴۰ء)

کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی
تعلیمات سے ماخوذ ہے،
(اکتوبر ۴۰ء)

وحی از روئے قرآن اور مدعی کا
تضاد بیان، (نومبر ۴۰ء)

وحی کے اقسام (دسمبر ۴۰ء)

ابوالبرکات بغدادی اور اس کی
کتاب المعتبر (جنوری، فروری ۴۱ء)

مولانا سجاد کی یاد (مارچ ۴۱ء)

دونوں جہان کی بادشاہی،
(ستمبر ۴۱ء)

موت العالم موت العالم،
(اگست ۴۳ء)

حیات شبلی، نومبر ۴۳ء

دیباچہ حیات شبلی (نومبر ۴۳ء)

حکیم الامت کے آثار علمیہ (فروری ۴۴ء)

قنوج، مارچ ۴۴ء

خطبۂ صدارت مجوزہ اردو کانفرنس
بنگال۔ (مئی ۴۴ء)

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، دسمبر ۴۴ء جنوری ۴۵ء

خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند ازمنہ وسطیٰ، (۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء) اجلاس آل انڈیا ہسٹری کانگریس، منعقدہ مدراس (دسمبر ۴۴ء اپریل ۴۵ء)

خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ العلماء، صوبہ بمبئی منعقدہ ۱۷ صفر ۱۳۶۴ھ (مئی ۴۵ء)

رومن کیتھولک تاریخ کی چند من گھڑت کہانیاں، (اگست ۴۵ء)

جامعہ حسینیہ راندیر میں تقریر، (ستمبر ۴۵ء)

امت مسلمہ کی بعثت (سیرت جلد ہفتم کا ایک باب) اپریل ۱۹۴۶ء

مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے، (اگست ۴۶ء)

حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی (نومبر ۴۶ء)

خطبۂ اشادطبیہ اسکول پٹنہ (دسمبر ۴۶ء)

اندراج نکاح وطلاق اور تقرر قضاۃ، مئی ۴۷ء

سیاسیات اسلام کے نظریے، (اکتوبر ۴۷ء)

مذکورۂ بالا مقالات میں سے اہل سنت والجماعت رسالہ کی صورت میں شائع ہوا اور اس کے ترجمے تامل اور تیلگو زبان میں ہوئے، "خلافت اور ہندوستان" اور "خلافت اسلامیہ اور دنیائے اسلام" بھی رسالوں کی شکل میں شائع کئے گئے، اور ۲۲-۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت کے پُر آشوب اور ہنگامہ پرور زمانہ میں اُن کے کئی ایڈیشن نکلے، سفرِ افغانستان میں اس سیر و سیاحت کا ذکر ہے، جب سید صاحب اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان تشریف لےگئے تھے، معارف میں یہ سفرنامہ شائع ہوا، تو لوگوں نے اُس کو بہت شوق سے پڑھا، اب یہ کتاب کی شکل میں "سیر افغانستان" کے نام سے نفیس اکیڈمی حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوگیا ہے۔ (باقی)

مکتوب امریکہ

از

مولانا محمد رابع ندوی

مئی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی امریکہ کے مسلمان طلبہ (M.S.A) کی دعوت پر امریکہ تشریف لے گئے تھے انکے ساتھ ان کے بھانجے مولوی محمد رابع ندوی بھی تھے، انھوں نے وہاں سے ایک مفصل خط لکھا تھا جس میں امریکی مسلمانوں اور ان کی تنظیموں کے بارہ میں مفید معلومات ہیں، قارئین معارف کی دلچسپی کے لئے خط کا ایک حصہ شائع کیا جارہا ہے، شروع اگست میں دونوں صاحبان بخیر واپس آگئے ہیں، قارئین کرام کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس سفر میں علی میاں کی آنکھ کا آپریشن بھی ہوگیا جو خدا کے فضل سے کامیاب رہا۔

"معارف"

میں اور خال معظم امریکہ ۲۷ مئی کو پہونچ گئے تھے، اسی روز سے انڈیانا Indiana کے شہر بلومنگٹن (Bloomington) میں M. S. A. یعنی شمالی امریکہ کے مسلم طلب کی جمعیت کا سالانہ اجتماع تھا، اسی لئے نیویارک سے وہاں روانہ ہوگئے، یہ اجتماع چار روز رہا، اس میں مختلف موضوعات پر تقریریں ہوئیں اور مقالے پڑھے گئے، خال معظم کی بھی کئی تقریریں ہوئیں، ان میں سے ایک تقریر پہلے سے باقاعدہ پروگرام میں تھی، اس کا موضوع تھا "اسلامی کام کرنے والوں کے مابین تعلقات" مسلم طلبہ کی یہ جمعیت ایک شورائی انجمن ہے اسکی

شاخیں ریاستہائے متحدہ اور کناڈا میں پھیلی ہوئی ہیں، دونوں ملکوں میں تقریباً اس کی ڈیڑھ سو شاخیں ہیں، اس کا مرکزی دفتر ریاست انڈیانا کے شہر انڈیانا پولس اور "پلین فیلڈ" میں ہے، اس کے صدر و سکریٹری نیز دیگر عہدہ داروں کا انتخاب سالانہ ہوتا ہے، اسی جمعیت کے تحت مسلمانوں کی ذہنی تربیت نیز دعوتی و تعلیمی مقاصد کے لئے مختلف شعبے قائم ہیں، ہر ایک کی کمیٹی اور عہدہ دار ہوتے ہیں، ان کا سربراہ جمعیت کا سکریٹری ہوتا ہے، اس جمعیت کو کئی سال قبل ان طلبہ نے قائم کیا تھا، جو شرق اوسط سے یہاں پڑھنے آئے تھے، وہ اب تو یہاں سے جا چکے ہیں یا کسی دوسرے کام میں لگ چکے ہیں، لیکن ان کا شروع کیا ہوا کام چل رہا ہے، ان میں قابل ذکر احمد توتنجی اور احمد صقر ہیں، اول الذکر شامی نژاد ہیں اور ریاض (سعودی عرب) میں کام کرتے ہیں اور آخر الذکر شکاگو یونیورسٹی میں استاد ہیں اور نیویارک کے دفتر رابطہ عالم اسلامی کے سربراہ ہیں۔

اب ایم، ایس، اے نے اپنے دستور میں یہ تبدیلی کر لی ہے کہ اس کے ممبر صرف طلبہ ہی نہیں بلکہ شمالی امریکہ میں مقیم دعوتی و اسلامی ذہن رکھنے والا کوئی مسلمان بھی ہو سکتا ہے، اس لئے اب یہ نام کے لحاظ سے تو صرف طلبہ کی انجمن ہے لیکن کام کے لحاظ اس کا زیادہ وسیع دائرہ رکھتی ہے، یہ اپنی شاخوں کی نگرانی بھی کرتی ہے اور ان کو فکری و دعوتی کمک بھی پہونچاتی ہے، اس کی اکثر شاخیں تو وہ ہیں جو در اصل مقامی انجمنیں تھیں اور انھوں نے اپنی تقویت کے لئے انجمن سے وابستگی اختیار کر لی ہے، اس کی شاخوں کو چیپٹر (Chapter) سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کے موجودہ صدر ایک ہندوستانی نژاد پاکستانی اور جنرل سکریٹری ایک اردنی عرب ہیں، اول الذکر کا نام یعقوب مرزا ہے اور وہ کناڈا میں پی، ایچ، ڈی کے طالب علم ہیں اور آخر الذکر کا نام محمد شدان ہے اور وہ یہاں سے

پی، ایچ، ڈی کر چکے ہیں، ایم، ایس، اے کے سکریٹریٹ میں اہم کارکنوں میں انیس احمد صاحب، جمال برزنجی بھی بڑے کار پرداز افراد ہیں۔

ایم، ایس، اے کی اس انجمن کے علاوہ شمالی امریکہ میں بہت سی دیگر انجمنیں بھی ہیں اور یہ اکثر صرف مقامی ہیں، ان کی تعداد بھی ریاستہائے متحدہ اور کناڈا دونوں میں ملا کر سو کے لگ بھگ ہوگی، ان میں سے بعض ریاستوں اور علاقوں تک محدود ہیں اور بعض تو صرف محلوں تک محدود ہیں، بعض شہروں تک، بعض کا کام خاصا حجم رکھتا ہے اور بعض کا بہت معمولی ہے، مقامی انجمنیں عام طور پر مقامی مدد اور چندہ سے چلتی ہیں، رہیں بڑی انجمنیں خاص طور پر ایم، ایس، اے، تو ان کو باہر سے خصوصی مدد لینی پڑتی ہے، اسکے بجٹ کا صرف ایک تہائی یا اس سے بھی کم حصہ ارکان کی فیس رکنیت اور مقامی امداد سے پورا ہوتا ہے۔

امریکہ میں مسلمانوں کی اب خاصی تعداد ہو چکی ہے، اندازہ ۲۰ ـ ۲۵ لاکھ سے کم نہ ہوگا، جن میں سے شہر نیویارک میں ایک لاکھ، ڈیٹرائٹ میں بھی ایک لاکھ اور شکاگو میں نصف لاکھ کی تعداد بتائی جاتی ہے، کیلیفورنیا کی ریاست میں بھی خاصی تعداد ہے، عام طور پر عرب، ہندوستانی، پاکستانی اور افریقی ہیں، اگر امریکہ کے کالے مسلمانوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد تقریباً ڈیوڑھی ہو جائے گی، ان کالے مسلمانوں کا معاملہ ابھی تک پورا واضح نہیں ہے، یہ اس وقت دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک تو صحیح الخیال مسلمانوں کا ہے جو در اصل مالکم اکس شہید کے طریقہ پر کار بند ہیں، جنھوں نے جماعت کے موسس ورہنما الیجا محمد سے علیحدگی اختیار کر کے صحیح عقائد اختیار کر لئے تھے اور پھر ان کو برداشت نہ کیا جا سکا اور شہید کر دیا گیا، اب ان کے طریقے پر چلنے والے اچھی تعداد میں

ہوگئے ہیں اور وہ پوری طرح مسلمانوں میں شامل ہیں۔ ان کے لئے کسی علٰحدہ جماعتی
اصطلاح کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

رہا اصل گروہ تو اپنے مؤسس ایلیجا محمد کے زمانہ میں تو بہت فاسد العقیدہ تھا، ایلیجا کو
نبی مانتا تھا اور جس شخص سے ایلیجاہ نے اس دین کو اخذ کیا تھا اس کو خدا کا درجہ دیتا تھا،
ایلیجاہ نے اپنے کو مسلمان کہا تھا، لیکن اس کے عقائد خود ساختہ تھے اور ایک نئے عقیدہ
اور نئے مذہب کے حامل تھے۔ ان کے بیٹے والس جو وارث الدین محمد کہلاتے ہیں، اگرچہ
بڑے بیٹے نہیں ہیں لیکن اب اس جماعت کے رہنما وہی ہیں، انھوں نے اسلامی تعلیمات
کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اپنی جماعت میں اصلاحات بھی کی ہیں اور اپنے کو مسلمانوں سے
مزید قریب کرلیا ہے لیکن ابھی اپنے والد کو اپنا رہنما سمجھتے ہیں، اسلام کے سلسلہ میں ابھی
ان کے خیالات مکمل طور پر صاف اور شبہہ سے بالاتر نہیں ہیں، اس لئے صحیح العقیدہ
کالے مسلمان ان کو بے راہ سمجھتے ہیں اور دیگر مسلمانوں کے ان سے اعتماد کے ساتھ
ملنے کو پسند نہیں کرتے، لیکن والس یا وارث الدین محمد اصل مسلمانوں سے خاصے قریب
آگئے ہیں، کچھ عجب نہیں کہ خالص صحیح عقائد کے پوری طرح حامل ہونے کا اعلان کردیں،
اور پھر وہ پردہ بھی ہٹ جائے جس نے ان کو صحیح مسلمانوں سے علٰحدہ کر رکھا ہے، اس
سلسلہ میں امریکہ میں مقیم دعوتی ذہن رکھنے والے مسلمانوں کی کوششیں بھی جاری ہیں،
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ والس کی نظر میں اپنے ماننے والوں کو اپنے ساتھ رکھنے کا مسئلہ
بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، انھوں نے اپنی جماعت کا نام "دی ورلڈ کمیونٹی آف
اسلام ان دی ویسٹ" رکھا ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر یہ بھی
ہے کہ کم از کم وہ امریکہ کے مسلمانوں کے واحد رہنما سمجھے جائیں، چنانچہ ان کا فرقہ اولاً کالے

مسلمانوں کے نام سے موسوم تھا، پھر ان لوگوں نے اپنے کو بلالی مسلمان کہنا شروع
کیا اور "ورلڈ کمیونٹی آف اسلام ان دی ویسٹ" کا نام دیتے ہیں، ان کا ایک آرگن
"بلالین نیوز" کے نام سے بھی نکلتا ہے، ان بلالی مسلمانوں کا مرکز شکاگو میں ہے،
اور ان کی خاصی تعداد اسی شہر میں رہتی ہے، کالے امریکی علی العموم امریکہ کے اکثر
شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں، کئی جگہ ان کے محلے کے محلے ہیں، ان کے خالص محلوں میں
بھی جانا ہوا، ان کو نظم وصفائی کے لحاظ سے سفید امریکیوں کے مقابلہ میں کمتر پایا،
البتہ یہ سننے میں آیا کہ حکومت کا محکمۂ نظم وصفائی ان کے علاقوں کو خاص طور پر نظرانداز
کرتا ہے، کارپوریشن کو جو شکایات پہونچائی جاتی ہیں وہ ان کی طرف توجہ نہیں کرتا، لیکن
اس میں مکمل تصور صرف منتظمین کا ہی نہیں ہے، کالے امریکیوں کی بھی کوتاہی ہے، ورنہ
توجہ دینے والے یہاں ہمسری کے ساتھ رہتے ہیں اور کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا، البتہ
پس ماندہ کالے امریکی زیادہ نظر آتے ہیں اور چھوٹے کاموں میں بھی وہ زیادہ نظر
آتے ہیں۔

کالے لوگوں میں عیسائی مذہب والوں کا بھی طبقہ ہے، کالے لوگوں میں شوریدہ سر
لوگوں کا بھی گروہ ہے جن سے امریکن سوسائٹی پریشان ہے، وہ اور ایسے سفید امریکی جو
غیر شہری رجحانات کے حامل ہیں، بڑے سنگین اور ذلیل جرائم کرنے سے باز نہیں رہتے
جن میں لوٹنا اور بآسانی قتل کردینا معمولی بات ہے، نیویارک شہر کی بعض گلیوں اور
سڑکوں پر رات کو لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں، کیونکہ وہاں قتل اور لوٹ معمولی بات ہے،
کالے باشندوں کے تذکرہ کے ساتھ یہ بات جاننے کی ہے کہ یہ لوگ بھی امریکہ کے
اصل قدیم باشندے نہیں ہیں، یہاں کے اصل باشندے سرخ ہندی "رڈ انڈین"

ہیں، جن کو یہ نام ہندوستانی ہونے کے باعث نہیں دیا گیا بلکہ شخصی تصور اندازہ کی بنا پر
دے دیا گیا تھا جو اب تک چل رہا ہے، یہ لوگ بڑے مظلوم ہیں، ان کو یورپ سے آئے
ہوئے لوگوں نے بڑی حکمت کے ساتھ آہستہ آہستہ ختم کرنے کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے،
ان کو محدود علاقوں میں شہروں سے علٰحدہ محدود کر دیا ہے، ان کو وظائف وغیرہ دیئے ہیں
اور ان کو شراب وعیاشی کا عادی بنا دیا ہے، وہ آہستہ آہستہ اس طرح ختم ہوتے جا رہے
ہیں، اب بہت کم تعداد میں رہ گئے ہیں، ان میں بعض لوگ پڑھ لکھ کر سنجیدہ شہری زندگی
بھی اختیار کرتے ہیں لیکن وہ خال خال ہیں، نظر نہیں آتے، اس طرح پر اب امریکہ میں
تقریباً سب باہر سے آئے ہوئے ہیں، کوئی ذرا قدیم، کوئی جدید، اور یہ اب ایک مخلوط
قوم ہے، یہاں کے کالے افریقہ سے آئے ہوئے ہیں۔

ایم، ایس، اے کی طرف سے خال معظم مولانا علی میاں صاحب کے لئے شمالی
امریکہ کے مختلف شہروں میں دورہ کا پروگرام بھی رکھا گیا جس میں جگہ جگہ کے مسلمانوں
سے ملنے اور ان سے خطاب کرنے کا موقع ملا۔

چنانچہ شکاگو، ڈیٹرائٹ، بوسٹن اور کیمبرج اور واشنگٹن، امریکہ کے مشرقی منطقہ میں
اور "لاس انجلس" اور "سان فرانسسکو" مغربی منطقہ میں اور کناڈا میں مونٹریال اور ٹورنٹو جانا
ہوا، ان کے علاوہ امریکہ کے اور بھی دیگر مقامات پر جانا ہوا جو اول الذکر سے کم اہمیت کے
تھے، تقریباً تمام جگہوں پر سامعین ہندوستانی، پاکستانی، عرب اور امریکی مسلمان ہوتے
تھے، خطاب کے بعد علی العموم سوالات کا سلسلہ چلتا تھا جن میں یہاں کے مقیمین زیادہ تر
یہاں کی زندگی سے پیدا ہونے والے مسائل اور مشکلات کا ذکر کرتے اور ان میں
رہنمائی چاہتے، ان مسائل میں سب سے اہم مسئلہ یہاں فروخت ہونے والے

گوشت کا ہوتا، اس مسئلہ کے اہم ہونے کی ایک مزید وجہ یہ بھی ہے کہ بعض عرب علماء
نے اس میں بہت سہولت کی اجازت دے دی ہے، اگرچہ اب یہاں پر بھی تقریباً
ہر شہر میں مسلم ذبیحہ گوشت ملنے لگا ہے لیکن نسبتاً گراں ہوتا ہے، مولانا نے
ذبیحہ کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ ہندو پاک کے سب علماء یہی رائے رکھتے ہیں
کہ اس کا ذبیحہ ہونا اور خدا کے نام پر ہونا ضروری ہے، پھر خواہ مسلمان کے ہاتھ سے
ہو خواہ کتابی کے ہاتھ سے، اور چونکہ یہودیوں کے یہاں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے
اس لئے ان کا گوشت "کوشر" صحیح ہے۔

امریکی نظام زندگی ایسا کسا ہوا اور مضبوط ہے کہ یہاں آکر قیام کرنے والے
اس سے اپنے کو علٰحدہ رکھنے سے عموماً قاصر رہتے ہیں، اس میں خاص طور پر تعلیم
ٹیلی ویژن، شہری اور گھریلو معیشت اہم پہلو ہیں، چنانچہ نوخیز نسل بالکل امریکی رنگ
میں خود بخود رنگتی جا رہی ہے اور اس کا وہ ذہن نہیں بنتا جو ان کے والدین کا ہے
جو کہ مشرقی ممالک میں تربیت حاصل کر کے یہاں پہونچے ہیں، جس کسی نوخیز نے یہاں
اپنی کم عمری کے دو چار سال گذار لئے، انگریزی اس کی مادری زبان بن گئی اور
دیگر کوئی زبان ہوئی تو وہ ثانوی رہی، ٹیلی ویژن جو ہر ہر گھر میں ہے کم از کم نوخیز
نسل کی تشکیل میں پورا کردار ادا کرتا ہے اور جو کسر رہ جاتی ہے وہ اسکولی زندگی
نیز محلہ کے ساتھیوں کا ماحول پوری کر دیتا ہے، اس کو دیکھ کر خطرہ معلوم ہوتا ہے
کہ اگر ضروری انتظام نہ کیا گیا تو مسلمان نسل کے اخلاف کا غیر مسلم ہو جانا کچھ مستبعد نہیں
ایسے کئی واقعات یہاں سننے میں بھی آئے ہیں، چنانچہ مسلمانوں میں اہل درد طبقہ
اس پہلو سے بہت متفکر ہے اور اس کے تدارک کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے، ایم ایس اے کا

بھی خاص حصہ ہے، جس کے کام کا میدان پورا شمالی امریکہ ہے، اس کے علاوہ اور کئی انجمنیں ہیں، مثلاً ایک انجمن ایم، سی، سی مسلم کمیونٹی سنٹر ہے، جس نے اپنے دائرۂ کار کو صرف شکاگو تک محدود کر رکھا ہے، اس کی نظر میں صرف شکاگو کو سنبھال لینا بذات خود بڑا کام ہے، جو پورے شمالی امریکہ کا دوسرے نمبر کا شہر ہے اور وہاں مسلمان ۵۰ ہزار کی تعداد میں ہیں، ان کے علاوہ کالے مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد وہاں رہتی ہے، چنانچہ ان کا ہفتہ وار اور روزانہ کا اسکول ہے، سیمینار، تقاریر، نیز دعوتی و تربیتی مقصد رکھنے والے متعدد پروگرام ہیں، ان کا کام بھی اچھا اور قابل قدر ہے، یہ اپنی جغرافی وسعت میں تو کم ہے لیکن علمی وسعت رکھتا ہے، لیکن ابھی اس کے آغاز کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے اور اس کو ابھی دشواریوں کا بھی سامنا ہے، مسلمانوں کی ایک طبی انجمن بھی ہے، یہ گویا مسلم میڈیکل یونین آف امریکہ کی سی حیثیت رکھتی ہے، یہ بھی اسلامی بنیاد پر قائم کی گئی ہے اور اسکا ایم، ایس، اے سے بھی رابطہ ہے، اسی طرح ایک دوسری انجمن علمی و ثقافتی ہے وہ بھی اسلامی اساس پر قائم کی گئی ہے اور اس کے کام کرنے والے بھی زیادہ تر ایم، ایس، اے کے ارکان ہیں، اس کے علاوہ ایک انجمن ہندوستانی مسلمانوں کی ہے، یہ انجمن بھی اپنے سالانہ جلسے کرتی ہے، اس میں اہم مسائل پر سیمینار اور مذاکرے ہوتے ہیں، باہر کے مفکرین کو بھی شرکت کی دعوت دیتی ہے، ہندوستانی مسلم طلبہ کی علمی و ثقافتی ضرورت کی طرف بھی توجہ دیتی ہے، چنانچہ اسی جولائی کے شروع میں اس کا سال رواں کا سالانہ جلسہ شکاگو میں ہوا ہے، اس کا نام "سی، سی، آئی، ایم، کنسالیڈیٹو کمپنی آف انڈین مسلمس ہے، اس نے اپنا نام مسلم مجلس مشاورت سے اخذ کیا ہے اور وہ اس کے پیغام سے متاثر ہے، یہاں کی یہ سب انجمنیں جمہوری طریقۂ کار رکھتی ہیں، اس کے ارکان کو باقاعدہ فیس

رکنیت ادا کرنا ہوتا ہے، فیس رکنیت سے حاصل ہونے والے سرمایہ نیز علیحدہ سے امداد اور چندوں سے ان کے مصارف پورے ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی انجمن کسی مسلم یا غیر مسلم ملک سے وابستہ نہیں ہے، افراد کے چندوں سے ان کا مالی نظام قائم ہے اور ان کا انتظامی ڈھانچہ شورائی اور انتخابی ہے، سال بسال نیا انتخاب ہوتا ہے اور جو ذمہ دار منتخب ہوتے ہیں وہ کام کو سنبھالتے ہیں، اسی وجہ سے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی انجمنوں میں سے اکثر کے صدر دفتر جگہ بدلتے رہتے ہیں اور چونکہ ان انجمنوں کے زیادہ تر ارکان طلبہ ہوتے ہیں اس لئے ان کا میدان بھی علی العموم یونیورسٹی سے متعلق مسلمان اور طلبہ نیز تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور چونکہ ان میں مختلف ممالک کے باشندے شریک ہیں اس لئے ان کے باہمی تبادلۂ خیالات کی زبان انگریزی ہے۔

ان مذکورۂ بالا علمی و ثقافتی اسلامی انجمنوں کے علاوہ یہاں ایک بڑا کام تبلیغی جماعت کا ہے، جو اپنے مخصوص ڈھنگ سے اصلاح و تربیت کی کوشش کرتے ہیں، ان کے اثر سے یہاں خاصی اصلاح ہوئی ہے، ان کے سالانہ اجتماعات بھی ہوتے ہیں اور جماعتیں بھی نکلتی ہیں، رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے بھی اب نیویارک کے دفتر کو پورے امریکہ میں اسلامی کام کا ذمہ دار بنا دیا ہے، چنانچہ اس کا کام بھی چل رہا ہے، اسمیں یہاں کے مسلمانوں کا مالی و علمی تعاون بھی شامل ہے، دفتر کے اسلامی شعبہ کے ذمہ دار ہمارے ایک ندوی مزمل حسین صدیقی مقرر ہوئے ہیں، وہ ہارورڈ یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی بھی کر رہے ہیں، رابطہ نے ابھی دو ماہ قبل یہاں شمالی امریکہ میں تمام اسلامی انجمنوں کی ایک کانفرنس بھی کی تھی۔

امریکہ میں یونیورسٹیوں کی بڑی کثرت ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹے شہر میں کئی کئی

یونیورسٹیاں ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں تو دس پندرہ یونیورسٹیوں سے کم نہیں ہوتیں اور بعض بعض شہر تو یونیورسٹیوں کے شہر کہے جاتے ہیں، کیونکہ ان کی آبادی کا بڑا حصہ یونیورسٹی نظام کا جزء ہوتا ہے، مثلاً بوسٹن، کیمبرج، جو کہ بڑے ہوئے شہر ہیں، یہاں تقریباً ۲۰ یونیورسٹیاں ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم اور مشہور ہارورڈ یونیورسٹی ہے، اس کا شعبۂ مشرقیات سب سے ممتاز ہے، امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں کی مختلف خصوصیات و امتیازات ہیں، وہ یونیورسٹیاں جو اپنے کسی نہ کسی شعبہ میں عالمی شہرت کی مالک ہیں، ان میں شکاگو یونیورسٹی، کیلیفورنیا کی برکلے یونیورسٹی، کیمبرج کی ہارورڈ یونیورسٹی، فلاڈیلفیا کی ٹمپل یونیورسٹی، ایسی ہی ...... ہیں جن میں مشرقی مسلمانوں کی آمد خاصی ہے، یوں تو اور بھی کئی یونیورسٹیوں میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے وہاں طلبہ پہونچتے ہیں اور تعلیم کی تکمیل کرتے ہیں،

امریکہ میں علمی تحقیقات کے سلسلہ میں ہر شعبۂ علم کی علیحدہ علیحدہ اکیڈمیاں ہیں جو اپنے اپنے شعبۂ علم میں تحقیقاتی کام کو ترقی دیتی ہیں اور اس کے متعلقین کی مدد کرتی ہیں اور ان کو معلومات فراہم کرتی ہیں، ان ہی میں ایک اکیڈمی مذہبیات کی ہے، پورے امریکہ میں اس کے پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) رکن ہیں، اس کے متعدد شعبے ہیں ابھی دو ایک سال قبل تک اسلام عیسائی شعبہ کا جزء تھا، اب تجرباتی طور پر اسلام کیلئے مستقل شعبہ شروع کیا گیا ہے، چار ارکان میں سے دو مسلمان، ایک عیسائی، ایک یہودی ہے، مذہبیات کی اکیڈمی اپنا ایک پرچہ بھی نکالتی ہے جس کا نام "دی جرنل آف امریکن اکیڈمی آف ریلیجن" ہے، اکیڈمی ہر سال چار روزہ اجلاس کرتی ہے جس میں تقریباً آٹھ سو مضامین پڑھے جاتے ہیں، تمام مضامین کو ۳۵ جگہوں پر تقسیم کردیا

جاتا ہے جس کا جو موضوع ہو اس میں شریک ہوسکتا ہے۔

ہائی اسکول تک یہاں تعلیم مفت ہے، لیکن صرف حکومتی اداروں میں جن کی تعداد کم ہے، پرائیوٹ اداروں میں جن کی تعداد یہاں بہت ہے تعلیم پر فیس لی جاتی ہے، یونیورسٹیاں سب پرائیوٹ ادارے ہیں، ان کی تعلیم کی فیس بہت زیادہ ہے، بعض بعض میڈیکل کالجوں کی فیس سالانہ دس بارہ ہزار ڈالر سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

امریکہ میں ہائی اسکول تک بارہ (۱۲) سال لگتے ہیں، جب کہ ہندوستان میں دس سال لگتے ہیں، یہاں یونیورسٹی کی تعلیم چار سالہ کورس پر مشتمل ہے اور اس کی تقسیم ہمارے یہاں کی طرح ایف، اے، بی، اے کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ نہیں ہے، اس کے بعد ایم اے ہے، یہاں پی، ایچ، ڈی میں علی العموم پانچ سال صرف ہوجاتے ہیں اور سخت محنت اور متنوع زبانوں اور مضامین سے ضمنی طور پر واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

یہاں یہ خوبی کی بات ہے کہ بڑی فرموں کی طرف سے ممتاز طلبہ کو وظیفے دئے جاتے ہیں اور چونکہ یہاں فرموں کی کثرت ہے اس لئے وظیفوں کی بھی کثرت ہے، اسکول و کالج کے ذمہ داروں کی رہنمائی سے ان کامیاب طلبہ کا انتخاب ہوتا ہے جو وظیفہ کے مستحق قرار پاتے ہیں، ان سے طلبہ کو بڑی مدد مل جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ محنتی اور ممتاز طالب علم کے لئے یہاں تعلیمی مصارف کا مسئلہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے کیونکہ وہ علی العموم وظیفہ یابی کے انتخاب میں آجاتا ہے، اس کے لئے ہر مرحلہ کے آخری امتحان سے کامیاب ہونے والے طلبہ کے لئے جلسۂ تقسیم اسناد ہوتا ہے، جس میں مختلف اداروں اور فرموں کے نمائندے بھی شریک ہوتے ہیں اور عموماً وہاں وظیفوں کا اعلان ہوتا ہے، جس سے طالب علم کی ہمت افزائی بھی ہوتی ہے اور علم دوستی کا اظہار بھی۔ لوگوں نے بتایا کہ اس طریقہ سے

فرموں کو بھی فائدہ ہوتا ہے، وہ اپنے اس سرمایہ کی حکومتی ذمہ داریوں سے بچ جاتی ہیں
جو ٹیکس کی صورت میں ان پر عائد ہوتی ہیں، یہاں ٹیکس کی شرح بہت زیادہ ہے، ہر
کمانے والے کو بعض اوقات آمدنی کا ۱/۲ حصہ ٹیکس میں دے دینا پڑتا ہے، یہاں انشورنس
کا بے حد رواج ہے، زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو انشورنس سے وابستہ کر دیا گیا ہے،
اور لوگ بھی اس دائرہ میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً علاج اور دوا میں، کیونکہ
یہاں علاج بے انتہا گراں ہے، اسپتال میں ڈاکٹر کو محض مرض بتانے اور علاج معلوم
کرنے کی ابتدائی فیس ۵۰ ڈالر ہے، پھر ہر علاج میں مختلف جانچوں سے گذرنا ہوتا ہے،
ہر جانچ کی فیس علیحدہ ہوتی ہے، اسپتال میں ایک بڈ حاصل کرنے پر کم ازکم ۱۶۰ ڈالر
فیس روزانہ دینی ہوتی ہے، یہاں دیگر عوامی ضرورت کے اداروں کی طرح اسپتال بھی
سب پرائیوٹ ہیں، یہاں اداروں کے پرائیوٹ ہونے کا ایسا عام سلسلہ ہے کہ ریلوے،
ہوائی سروسیں، ٹیلی فون، تار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سب پرائیوٹ ہیں اور ان میں مقابلہ کی
اس کی وجہ سے سب کا کام اچھا اور چست ہے، پوری زندگی پر تجارت کی روح غالب ہے،
نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کام بغیر پیسہ صرف کئے نہیں ہو سکتا، حکومت کا کام عموماً کنٹرول کرنا،
ٹیکس وصول کرنا اور دیگر متعدد مرکزی ذمہ داریاں پوری کرنا ہے، تجارت وصنعت پر
یہودیوں کی گرفت ہے اور چونکہ ملک کی ترقی کا انحصار اسی پر ہے اس لئے پورے
ملک پر ان کی گرفت ہے، ان کے رجحان کو کسی میں مسترد کرنے کی جرأت نہیں، ان کی
مرضی کے خلاف امریکہ سے کسی اقدام کی توقع رکھنا فضول ہے، خواہ اسرائیل کا مسئلہ ہو یا
کوئی اور مسئلہ۔

ملک ترقی کی اس منزل پر پہونچ گیا ہے جو ٹکنالوجی اور انسان کی سائنٹفک

کوششوں کی معراج ہے، بجلی سے جو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا ممکن ہے اور مشین سے
انسانی کام لینے کی جو صورتیں ممکن ہیں وہ سب اختیار کی گئی ہیں اور چونکہ یہاں دولت کی
کوئی کمی نہیں ہے اس لئے دنیا میں سب سے زیادہ اسی ملک کو ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانے
میں بلند معیار حاصل ہے، یہ اب ان باتوں میں یورپ سے بھی اتنا آگے ہے جتنا یورپ
مشرقی ممالک سے، ساری تجارت، کاروبار زندگی کے دوسرے مشاغل میں کمپیوٹر ایک عام
ذریعہ بن گیا ہے، اس کے ذریعہ انسان دماغی محنت کے تفصیلی اور پیچیدہ کاموں میں
پوری مدد لیتا ہے اور اس سے اس کے وقت اور تعداد میں بڑی کفایت ہو جاتی ہے،
انسانی محنت کی جگہ پر مشینی محنت کو استعمال کرنے کا یہ حال ہے کہ خرید و فروخت کے
بھی بہت سے کام مشین سے انجام پاتے ہیں، بڑے بنکوں اور فرموں نے تجارتی کارڈ
جاری کئے ہیں، ان کو دکھانے یا مشین میں ڈالنے سے آدمی چیزیں خرید لیتا ہے اور
فی الفور ادائیگی سے بچ جاتا ہے، ہم نے ان کارڈوں سے ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل
کرتے دیکھا ہے، ٹیلی فون کی عمومیت ایسی ہے جیسی عمومیت ہمارے ہندوستان میں
بجلی کے کنکشنوں کی نہ ہوگی، یہاں کوئی گھر ٹیلیفون سے خالی نہیں، خواہ دیہات کا ہو
یا شہر کا، اور کوئی شہر یا دیہات ڈائلنگ نظام سے خارج نہیں اور ٹیلیفون کی پابندی
عمل ایسی کہ کسی سے کہیں رابطہ قائم کرنے میں ادنیٰ دیر نہیں لگتی، پھر ٹیلیفون کے
ذریعہ بکنگ رزرویشن اور بہت سے پیچیدہ کام بھی بآسانی انجام پاتے ہیں، ٹیلیفون
درخواست دیتے ہی لگتا ہے اور معمولی فیس سے کام چلتا ہے، یہاں فاصلوں کی دوری
اور وقت کو بچانے اور جلد کام انجام دئے جانے کے شوق و ضرورت نے ٹیلیفون کی
اہمیت بہت بڑھا دی ہے اور ٹیلیفون اس ضرورت کو پورا کرتا ہے، ٹیلیفون کا محکمہ

یہاں سرکاری نہیں ہے بلکہ پرائیوٹ ہے۔

معیار زندگی کا اندازہ یہ ہے کہ ڈالر جو ہندوستانی روپیہ سے تقریباً آٹھ گنی قیمت رکھتا ہے ایک عام آدمی کو یہاں اس سے زیادہ ملتا ہے جتنا کہ اس کو ہندوستانی روپے ملتے اور اس میں وہ یہاں کے معیار کے مطابق زندگی گذارنے میں دشواری محسوس نہیں کرتا ہر صاحب خاندان جس طرح مکان رکھتا ہے، موٹر بھی رکھتا ہے، کیونکہ فاصلوں کی طوالت کی وجہ سے یہی ذریعہ مواصلات ہے۔

یہاں بکثرت اشیا قسطوں پر مل جاتی ہیں، لوگ مکان تک بآسانی قسطوں پر خرید لیتے ہیں، لیکن ان سب میں سود چلتا ہے اور نتیجۃً اصل قیمت کا دوگنا دینا پڑتا ہے، لیکن چھوٹی قسطوں کی سہولت نیز حسب خواہش وضرورت چیز مل جانے سے لوگ بآسانی قبول کرتے ہیں۔

طب، قانون اور مالیات کے میدانوں پر اسی فیصد اور نشریاتی میدان پر تقریباً سو فیصد قبضہ یہودیوں کا ہے، یہی وجہ ہے کہ سودی اور تجارتی مزاج نے زندگی کے ہر پہلو کو رنگ دیا ہے، انشورنس زندگی کے رگ وپے میں سمایا ہوا ہے، انشورنس یہاں کے باشندوں کو اچانک پیش آنے والے مصارف میں خصوصی امداد ملنے کی جاذبیت بھی رکھتا ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً علاج کے مصارف یہاں ناقابل برداشت ہیں، انشورنس سے ان میں مدد ملتی ہے۔

یہاں ضروریات وکمالیات زندگی کے مصارف بے انتہا ہیں اور ان میں خوب اسراف ہوتا ہے، اگر صرف ماکولات میں امریکہ اسراف ترک کردے تو ساری دنیا کی غربت ختم ہوسکتی ہے، اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی ۶۰ فیصد اشیا صرف امریکہ میں صرف کی جاتی ہیں،

۴۰ فیصد باقی دنیا میں، حالانکہ امریکہ کی آبادی ساری دنیا کا بارہواں یا تیرہواں حصہ ہوگی،

یہاں کے اخراجات کا معیار یہ ہے کہ تنہا نیویارک کارپوریشن کا بجٹ تقریباً سارے ہندوستان کے بجٹ کے قریب ہے، یعنی ۱۴۰ ارب ڈالر، جو ایک کھرب روپیوں سے زیادہ کے مساوی ہے، حالانکہ کارپوریشن کے مصارف کارپوریشن کے ہیں، اصل گورنمنٹ کے اس سے علیحدہ۔

امریکہ میں جو ترقیات نمایاں نظر آتی ہیں ان میں کمپیوٹر کا وسیع استعمال، شاہراہوں کی کثرت اور حسن انتظام، شاہراہوں نے چھوٹے بڑے شہروں کو ایک طرفہ راستوں کے نظام میں منسلک کردیا ہے جس میں کراسنگ نہیں ہے، موٹر والوں کو تیز موٹر چلانے میں آسانی رہتی ہے، یہ کراسنگ کی ضرورت پڑنے پر اوپر نیچے گذر جاتی ہیں، کراس نہیں کرتیں، ان پر پندرہ پندرہ، بیس بیس میل پر چائے خانے اور لیٹرین بنے ہوئے ہیں، یہ آبادیوں کے باہر سے گذرتی ہیں اور چھوٹی شاہراہوں کے ذریعہ آبادی سے جڑتی ہیں، ان میں بڑی شاہراہیں جو ہائی وے کہلاتی ہیں بارہ بارہ سولہ سولہ رو کی ہوتی ہیں، نصف تعداد آنے کی اور نصف تعداد جانے کی، یہ شاہراہیں دیکھ کر محنت اور ترقی کی داد دینی پڑتی ہے۔

ان ساری مذکورہ بالا باتوں کے ساتھ ساتھ سارا ملک زندگی کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے، زندگی کی جو شکل بنتی جاتی ہے آدمی اس کا تابع بنتا جاتا ہے اور اپنے کو اسکی غلامی سے نکال نہیں سکتا، رائج زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اس کو سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور اپنے وقت کا بڑا اور طاقتور حصہ اسی کی نذر کردینا پڑتا ہے، انسانی یا مذہبی کاموں کے لئے اس کے پاس وقت نہیں بچتا، روزانہ پورے آٹھ گھنٹے

کام، تقریباً دو گھنٹہ کام کے سلسلہ میں آمد و رفت، پھر اپنی ضروریات کی خود انجام دہی میں انسان کا بہت زیادہ وقت لگ جاتا ہے، ہفتہ میں دو روز چھٹی ہوتی ہے جو ہفتہ بھر کی محنت کے بعد آرام کی طلب میں گذر جاتی ہے، اسی لئے اس وقت کو خوب لطف و آزادی کے ساتھ گذارنے کا جذبہ پایا جاتا ہے، امریکہ نے شخصی آزادی اور جمہوری طریقۂ زندگی کا نظام اختیار کیا ہے، اس میں مذہبی اور اخلاقی پہلو بھی داخل ہیں، آدمی مذہب و اخلاقیات میں جو طریقہ اختیار کرے، کوئی اس کو روکنے یا اعتراض کرنے والا نہیں، اس لئے لوگ من اپنی خواہش اور مرضی پر چلتے ہیں اور مشرق کی بری باتیں یہاں بری نہیں کہی جاتیں۔

چند باتیں جو یہاں کے مشاہدات سے سمجھ میں آئیں تعمیل حکم میں لکھدیں۔

(دار المصنفین کی دو نئی کتابیں)

تذکرۃ المحدثین

حصّۂ دوم

اس کا پہلا حصہ جو ائمۂ صحاح کے علاوہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کے حالات و سوانح اور اُن کی شاندار حدیثی خدمات پر مشتمل تھا، یہ دوسرا حصہ چوتھی صدی کے آخر سے آٹھویں صدی تک کے اکثر مشہور صاحب تصنیف محدثین اور اصحاب حدیث کے حالات اور حدیثی خدمات، اور کارناموں پر مشتمل ہے،

مولفہ ضیاء الدین اصلاحی، قیمت :- ۱۶ روپیہ

غالب

(مدح و قدح کی روشنی میں)

حصۂ اول قیمت :- ۱۵ روپے۔ مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن،

استدراک

از عبد السلام قدوائی ندوی

گزشتہ ماہ کے معارف میں وفیات کے تحت مولانا محمد سلیم مرحوم کے مختصر حالات شایع ہوئے ہیں، اس میں ص ۱۴۷ کی آخری سطر میں "انکے بھتیجے کے بعد" کے لڑکے کا اندراج رہ گیا ہے، اسے درج کر لیا جائے، مولانا محمد سعید مولانا رحمۃ اللہ کے بھتیجے نہیں تھے، بلکہ انکے بھتیجے محمد صدیق صاحب کے لڑکے تھے۔

اسی طرح ص ۱۴۷ کے دوسرے پیراگراف میں جہاں پادری فنڈر سے مناظرہ کا ذکر ہے، اس جگہ کی عبارت سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ مولانا اسکے بعد ہی مکہ معظمہ چلے گئے تھے، یہ صحیح ہے، کہ ردّ مسیحیت کی وجہ سے مولانا انگریزوں کی نظر میں کھٹکنے لگے تھے، پادری فنڈر کی شکست کے بعد انکی ناراضی بہت بڑھ گئی تھی، مگر اسکے باوجود مولانا نے ہندوستان نہیں چھوڑا، اور بدستور اپنے کام میں لگے رہے، آگرہ کا یہ مناظرہ سنہ ۱۸۵۴ء میں ہوا تھا، اسکے تین برس بعد سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی، مولانا رحمۃ اللہ نے بھی اس میں حصہ لیا، جب انقلاب کی یہ کوشش ناکام ہوئی اور ہندوستان پر پھر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا، تو مولانا بھی باغی قرار پائے، اور ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا، کچھ دن احباب و معتقدین نے پوشیدہ رکھا، لیکن جب یہ تدبیر ناکام ہوتی نظر آئی اور یہ محسوس ہوا کہ مولانا کے ساتھ سیکڑوں اور بندگانِ خدا بھی انگریزوں کے غضب کا شکار ہو جائینگے تو مخلص دوستوں نے ہجرت کا مشورہ دیا،

مولانا جب مکہ معظمہ پہونچے تھے تو سلطان عبد المجید کا زمانہ تھا، انکے بعد سلطان عبد العزیز اور سلطان عبد الحمید ثانی خلیفہ ہوئے، قسطنطنیہ کا پہلا سفر سنہ ۱۲۸۶ھ میں سلطان عبد العزیز کے عہد میں ہوا، دوسرا سفر سنہ [illegible] میں اور تیسرا سفر سنہ ۱۳۰۱ھ میں سلطان عبد الحمید ثانی کے دور حکومت میں ہوا۔

مطبوعات جدیدہ

الامام البخاری (عربی) مرتبہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۹۶ پتہ۔ دار القلم، دمشق۔ بیروت،

صحیح بخاری حدیث کی سب سے معتبر کتاب ہے، اس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، اس لیے امت نے اس کے اور اس کے مصنف کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اور ان دونوں کے متعلق ہر زمانہ میں بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کو اس دور کے نامور محدث مولانا محمد زکریا صاحب سے استفادہ کا موقع ملا ہے، اور وہ کئی سال تک دار العلوم ندوہ اور گجرات کے مدارس میں حدیث کا درس بھی دے چکے ہیں، اور چند ممتاز ائمہ حدیث کے تراجم اور فن رجال پر اردو میں بعض کتابوں کے مصنف بھی ہیں، اب بلاد عربیہ میں مقیم ہیں، اسلئے عربی زبان میں بھی تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا ہے، پہلے امام ابوداؤد پر اور اب امام بخاری پر یہ رسالہ چھپا ہے، اس کے پہلے حصہ میں امام صاحب کے حالات، سوانح، فضائل اور مناقب اور دوسرے میں صحیح بخاری کی اہمیت، خصوصیت اور عظمت کا ذکر ہے دوسرے حصہ سے مصنف کی محنت اور اچھی نظر کا اندازہ ہوتا ہے، اس میں صحاح ستہ میں صحیح بخاری کا درجہ متعین کیا گیا ہے اور صحیح مسلم سے مناسب انداز میں موازنہ بھی کیا گیا ہے نیز اس کی شرطوں، ابواب و تراجم کی خصوصیات اور انکی باہمی ترتیب و مناسبت وغیرہ پر مفید گفتگو بھی ہے، یہ رسالہ نہ زیادہ طویل ہے اور نہ بہت مختصر، اس میں اکثر ضروری اور اہم پہلو آگئے ہیں اس حیثیت سے یہ حدیث کے طلبہ کے مطالعہ کے لائق ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مختصر مقدمہ بھی ہے،

آئینۂ ابوالکلام آزاد مرتبہ۔ جناب عتیق صدیقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش قیمت عـ۲ پتہ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دہلی۔

یہ کتاب دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم پر آٹھ مقالات کا مجموعہ ہے شروع کے چار مضامین بالترتیب ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، اور خواجہ غلام السیدین کے قلم سے ہیں، ان سب میں مولانا کی شخصیت، علم و فضل، ذہانت، شرافت، عظمت، سیاسی بصیرت، تعلیمی خیالات، ملک و ملت کی قیادت میں ان کے زاویۂ نظر اور دوسری نمایاں خصوصیات کا ذکر ہے، جناب عبداللطیف اعظمی کے مضمون میں مولانا کے متعلق ان کے اکثر ممتاز معاصرین کے تاثرات نقل کیے گئے ہیں، جناب ریاض الرحمن خان شروانی نے اپنے جد محترم اور مولانا کے "صدیق مکرم" مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم سے انکے تعلقات کی نوعیت دکھائی ہے، اور لائق مرتب نے غبار خاطر کی مدد سے قلعہ احمد نگر کی اسیری کی روداد تحریر کی ہے، حمیدہ سلطان صاحبہ نے مولانا کی رفیقۂ حیات کے ان سے تعلق و اخلاص کا ذکر کیا ہے، دوسرا حصہ دور اول و دوم کے الہلال کی ایک ایک تحریر، مولانا کے بارہ خطوط اور لکھنؤ مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت پر مشتمل ہے، شروع میں پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین پروفیسر ہمایوں کبیر اور سجاد انصاری کا خراج عقیدت ہے، گو اس مجموعہ کے تقریباً سب مضامین اور تحریریں مطبوعہ ہیں، تاہم انکی حیثیت قند مکرر کی ہے، البتہ مولانا کے یہ خطوط سردار محمد اکبر خان (پاکستان) کے نام تھے، اور گو یہ بھی وہاں چھپ چکے ہیں، لیکن ہندوستان والوں کی دسترس سے باہر تھے، اس لئے امید ہے کہ یہاں شوق سے پڑھے جائیں گے، ان سے پہلی بار معلوم ہوا کہ مولانا ترجمان القرآن کی تیسری جلد بھی مکمل کر کے کاتب اور پریس کے

حوالے کر چکے تھے، مگر پھر کیا افتاد پیش آئی اس کا کچھ ذکر نہیں، مولانا پر کئی کتابیں اور مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں، لیکن ابھی ان کی ایک اچھی سوانح عمری کی ضرورت باقی ہے، مرتب کو مولانا سے بڑی عقیدت ہے، ان کو بھی اس کمی کا احساس ضرور ہوگا کاش اس کی جانب وہ متوجہ ہوتے،

امجد علی شاہ ۔ مرتبہ جناب سبط محمد نقوی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۰۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت - ۱۵ روپے، پتہ: از مصنف اکبر پور، فیض آباد،

اس کتاب میں تاجدار اودھ امجد علی شاہ کی زندگی اور ان کے عہد حکومت کے واقعات آٹھ ابواب میں بیان ہوئے ہیں، پہلے باب میں سلطنت اودھ کی مختصر تاریخ اس کے بعد کے تین ابواب میں امجد علی شاہ کی ولادت تعلیم و تربیت، ولی عہدی، وزارت عظمیٰ، تخت نشینی نظم مملکت، تعمیری کوششوں اور علمی و دینی کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے، پانچویں باب میں انگریزوں سے ان کے تعلقات کا ذکر ہے ایک ایک باب شاہ کے سب سے معتمد وزیر امداد حسین امین الدولہ اور سلطان العلماء مولانا سید محمد کے حالات کے لیے خاص ہیں، آخری باب میں امجد علی شاہ پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، مگر مصنف نے بعض نزاعی اور مختلف فیہ امور کا بھی ذکر کر دیا ہے، انھوں نے امجد علی شاہ کی دینداری کو خاص طور پر بیان کیا ہے مگر ان کی دینداری ان کی اپنی روایات کے مطابق تھی، یہ کتاب پر از معلومات ہے اور اس سے تاریخ اودھ پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، مصنف کو تاریخی تحقیق سے خاص دلچسپی ہے، اس کتاب کو لکھنے میں جو کاوش و محنت کی گئی ہے وہ داد کی مستحق ہے

جلد ۱۲ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۷ء عدد ۴

مضامین